قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

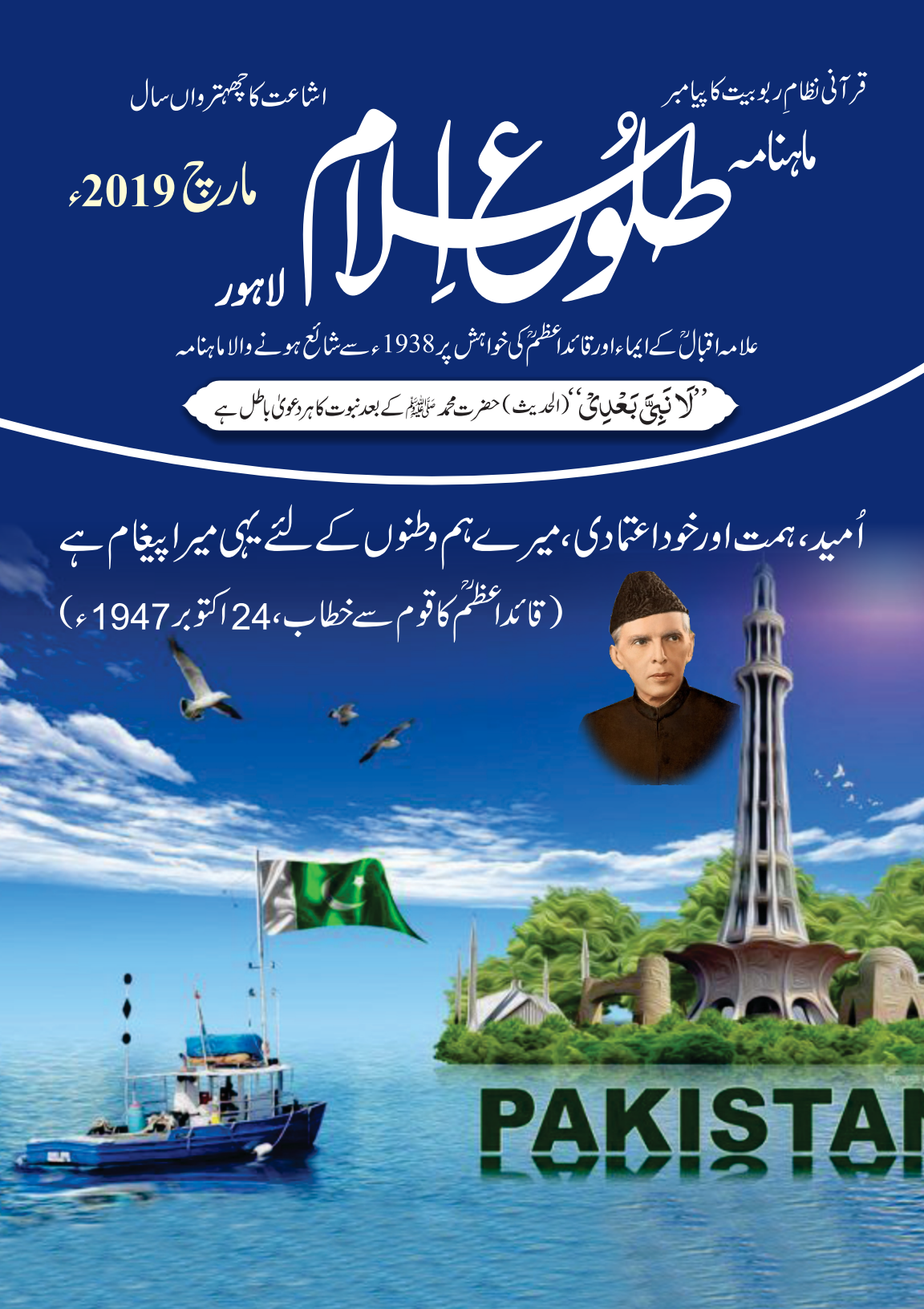
مارچ 2019ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

اُمید، ہمت اور خود اعتمادی، میرے ہم وطنوں کے لئے یہی میرا پیغام ہے

(قائداعظمؒ کا قوم سے خطاب، 24 اکتوبر 1947ء)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنیٰ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنیٰ خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص وصفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات و اقدارِ خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار و احکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

مارچ 2019ء

جلد 72 شمارہ نمبر 3

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: سپاسنامہ، بخدمت قائداعظم محمد علی جناحؒ	ادارہ	3
اسلام کے مقابل اسلام (قسط دوم)	غلام احمد پرویزؒ	8
چینی نظام اور ریاستِ مدینہ کے درمیانی فاصلے	خواجہ ازہر عباس، کراچی	25
دوقومی قرآنی نظریہ، پر مطالبہ پاکستان، (قسط نمبر:25)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	35
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر:12)	محمد علی صابر صدیقی	48

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 550 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Principle for Success and Reasons for Downfall – By Sir Syed, 1896

(ترقی کے اصول اور تنزل کے وجوہ)

(Translated by: Mansoor Alam)

[*Maqalaat-e Sir Syed; Ed. Maulana Ismail Panipati;* ***Publisher, Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, Lahore, 1963]***

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سپاسنامہ

بخدمت قائداعظم محمد علی جناحؒ

(23مارچ1940ء)

مارچ 1940ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں طلوعِ اسلام نے بھرپور شرکت کی۔ اپریل 1940ء کے شمارہ میں اس اجلاس کی روئیداد میں طلوعِ اسلام کے اُس سٹال کا ذکر بھی ملتا ہے جو اجلاس کے دوران لیگ کے پنڈال کے باہر نصب کیا گیا تھا۔ سٹال کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے مدیر طلوعِ اسلام لکھتے ہیں کہ ''سٹال سے ہمارا مقصد پمفلٹوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ کرم فرمایانِ طلوعِ اسلام سے ذاتی طور پر متعارف ہونا تھا اور شکرِ ایزدی کہ اس باب میں ہم فائز المرام واپس لوٹے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ہندوستان سے دُور دراز اور غیر معروف گوشوں کے لوگ آئے اور کوئی ایسا نہ تھا جو طلوعِ اسلام سے پہلے ہی واقف نہ ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا صدقہ ہے کہ جو اس مردِ مومنؒ کی دعاؤں کے طفیل ہمارے حال پر ارزاں ہوا جس کی یاد طلوعِ اسلام کا سرمایۂ زندگی ہے۔ ہمارے لئے یہ امر باعث صد مسرت تھا کہ جو حضرات وہاں تشریف لائے۔ ان کا ادارہ سے محض ایک رسالہ کے خریدار کا سا تعلق ہی نہ تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو ادارہ کا ایک جز سمجھتے تھے۔ ادارہ کے ساتھ ان کا رشتہ علمی کی بجائے یکسر قلبی تھا۔ سٹال پر ویسے بھی ہماری توقعات سے بڑھ چڑھ کر رونق رہی اور اس ہجوم میں ہمارے بعض احباب اگر ہمارا ہاتھ نہ بٹاتے تو ہمیں بڑی مشکل کا سامنا ہوتا۔ بعض کتابیں سٹال پر اتنی جلد ختم ہو گئیں کہ ایک کثیر تعداد حضرات کو مایوس لوٹنا پڑا۔''

یاد رہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا دفتر اُن دنوں دہلی میں تھا اور غلام احمد پرویزؒ بھی دہلی ہی میں مقیم تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے مذکورہ بالا اجلاس میں شرکت کے لئے نہ صرف یہ کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا وفد دہلی سے لاہور آیا بلکہ اپنی والہانہ محبت اور عقیدت کے پیشِ نظر ادارہ نے اس تقریب میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ ذیل میں تجدید یادداشت کے لئے اُسے آج پھر سامنے لایا جا رہا ہے۔ (مدیر)

بہ شرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بیباکی وحریت۔ ضیغمِ نیستانِ جرأت وبسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر وسیاست۔ پروانۂ شمعِ اخوّت وحمیت۔ طرۂ کلاہِ مُلک وملت۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں۔ وقائدِ اعظمِ اسلامیان۔ محترم المقام جناب محمد علی جناح (مدظلہٗ العالی)

حریت نواز!

ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہوکر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے تحت خاموش ہوچکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا۔ سر پر منڈلانے والی شبِ تیرہ وتار کی ہیبت انگیزیوں کا پیامِ جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آرہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آرہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت وسیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں کہ دُور اُفقِ اُمید سے ایک شاہسوار رواں دواں اُمیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت وبربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت اُن راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز سے مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر اُڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور اُنہیں اپنے ساتھ بہالے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کرکے آرہی تھیں۔ غیر تو غیر، خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ ؎

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیاء پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُرنور تھیں۔ 21 اپریل 1938ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اِس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چُن لیا اور آپ کی نگاہِ دُوررس نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گردوپیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں جن میں کہیں ''متحدہ قومیت'' کے دامِ ہمرنگِ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہورہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال وپر کو غبار آلودۂ ارض وبوم بنا کر اُمتِ رسول ﷺ کا فتہ لتاس کو جغرافیائی حدود کی آب وگل میں محبوس کیا جارہا تھا۔ کہیں ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠'' (42:38) کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخابات کے سراب کو آبِ حیواں بنا کر دکھایا جارہا تھا۔ کہیں اس ''اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ'' (4:59) مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت وقیادت کو عین دین قرار دیا جارہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف ''متحدہ محاذ'' کے طلسم سے کفار ومشرکین سے تولیٰ کے جواز کے فتاویٰ شائع ہورہے تھے۔

ایک طرف ایک مغنی آتش نفس سرودگاہِ واردھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندِ مکتب شاہین بچوں کے لئے، اہمسا کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں ''رام راج'' کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے ''شریفانہ معاہدے'' Gentleman Agreement استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور وغوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے 9 کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجر ہلال، جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجہ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی، اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقت عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ ؎

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جان گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان ''اپنوں'' کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہِ واردھا (Radio Station) کے آلات مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان ''مخلص منافقین'' کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش ازیں نیست کہ ؎

کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجہ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجومِ مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجود، تگ و دِ حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہئے۔ جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال وظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں وہ آپ کی بلند نگہی اور حسنِ تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبداءِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پُرسوز و پُر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب ونظر اور عقل وعشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاعِ گراں بہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دِل نواز، جاں پُر سوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اُس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت وامارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور اُن کی خاطر آپ نے جو گرامی قدر قربانیاں کی ہیں، اُن کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے Constitutionally ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا، لیکن ہمیں اُمید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ وخدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے، یہ طوفانِ بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص ودیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ:

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ (11:43)

سید القوم! ادارۂ طلوعِ اسلام، جسے ہزار ہا پُرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے، اجلاسِ لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہے اور متدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اُٹھ رہا ہے، قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جایئے۔ اس نصب العین کے اصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش وسر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن چوں پختہ شوی خودرا بر سلطنتِ جم زن

اراکینِ ادارہ طلوع اسلام، دہلی

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے!

اسلام کے مقابل اسلام

قائداعظم کے یومِ پیدائش کی تقریب، منعقدہ 24 دسمبر 1982ء پر پرویزؒ صاحب کا خصوصی درس

آپ نے دیکھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران بنیادی وجۂ نزاع کیا تھی؟ یہ درحقیقت اسلام کے دو تصورات کا ٹکراؤ تھا۔ اسلام کا ایک تصور یہ تھا کہ حکومت کسی قسم کی بھی ہو اس میں اسلام پر عمل ہو سکتا ہے۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ اس کے لئے الگ آزاد مملکت کا قیام لاینفک ہے۔ جس میں حکومت قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد:

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان مذہب پرست جماعتوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان کے لئے ایک قطعۂ زمین حاصل ہو گیا۔ یہ ان کی شکست تھی لیکن انہوں نے اس شکست کو فتح سے بدلنے کے لئے مختلف تدابیر سوچ لیں۔ (جیسا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اعلان کیا تھا) ہندو حکومت کے یہ ارادے تھے کہ سیاسی اور عسکری سطح پر ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن سے مملکت پاکستان کا (خاکم بدہن) وجود ہی باقی نہ رہے۔ لیکن مذہب پرست جماعتوں نے یہ ارادہ کیا کہ یہ جداگانہ مملکت قائم رہتی ہے تو رہے، لیکن اس میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ اسلام وہی نافذ ہو جس کے علمبردار علماء حضرات ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ یہ تمام جماعتیں پاکستان آ جائیں اور یہاں اپنے تصور کے نفاذ کی کوشش کریں۔ چنانچہ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی یہ سب ہجوم کر کے اِدھر آ گئے۔ ہندوستان سے پاکستان کی طرف آنے والے مسلمان عوام بیچارے تو لاکھوں کی تعداد میں قتل ہو گئے۔ ان کے قافلے لوٹے گئے۔ ان کی عصمتیں برباد ہو گئیں۔ یہ تباہ اور برباد ہو گئے۔ لیکن مذہب کے علمبردار حضرات امن و امان سے بحفاظت اِدھر منتقل ہو گئے۔

اقوامِ مغرب کی طرف سے مخالفت:

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ حقیقی اسلام کے نفاذ سے ہندو ہی لرزاں و ترساں نہیں تھا۔ مغرب کی سرمایہ پرست اور سیکولر نظام کی حامی اقوام بھی اس سے خائف تھیں۔ اس لئے ان کی بھی یہی کوشش تھی کہ (اوّل تو پاکستان بنے ہی نہ، اور اگر یہ بن بھی جائے تو یہاں) اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا حقیقی اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس کی

نگہِ بصیرت نے اس خطرے کو بھی بھانپ لیا تھا۔ ان کی آخری تصنیف ''ارمغانِ حجاز'' میں ایک نہایت شگفتہ اور بلیغ نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ اس میں انہوں نے بڑے دلکش محاکاتی (ڈرامائی) انداز میں، ان اقوام کے اس خطرہ کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے کیا سوچا ہے۔ انداز اس نظم کا یہ ہے کہ ابلیس اپنی کابینہ کی میٹنگ منعقد کرتا ہے جس میں ہر شعبے کا مشیر اپنی اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرتا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کو ابلیسی راستوں پر ڈالنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ صدرِ مجلس، ابلیس، ان رپورٹوں کو بڑی توجہ سے سنتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ تم نے جن تحریکوں کو ابلیسی پروگرام کے راستے کی رکاوٹ بتایا ہے مجھے ان میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ ان کے برعکس ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

تم نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ کمیونزم میں ہمیں بڑا خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تمہاری نگاہ حوادثِ عالم کی سطح پر ہے اور

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جب ابلیس نے کہا تھا کہ اسے درحقیقت خطرہ اُمتِ مسلمہ سے ہے تو اس کے مشیروں میں کچھ چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ اس پر اس نے کہا کہ تمہارے دل میں جو شکوک اُبھر رہے ہیں، مجھے ان کا احساس ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں مَیں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

میں یہ سب جانتا ہوں:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

وہ شرعِ پیغمبر ﷺ۔ یعنی قرآنی نظام، جس کی خصوصیات یہ ہے کہ:

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب! پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ ''آئیں'' تو خوب یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہارے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!

انہوں نے کہا کہ اس کے لئے کرنا کیا چاہئے؟ اس نے کہا کہ یہ قوم بڑی مذہب پرست واقع ہوئی ہے، اس لئے اس سے مذہب کا چھڑا دینا مشکل ہے۔ قرآن ان کے ہر گھر میں ہوتا ہے۔ انہیں کھلے بندوں اس سے بیگانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے لئے بڑے پُرفریب حربہ کی ضرورت ہوگی، اور وہ یہ کہ ان میں نظری مسائل کی بحثیں چھیڑ دو:

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اوراس طرح:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے تابساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

پھر سُن رکھو کہ:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس خطرہ سے محفوظ و مامون رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبگاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے مراد صرف تصوف کی خانقاہیت نہیں۔ وہ مذہب بھی ہے جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔

علامہ اقبالؔ نے پاکستان کا تصور دینے کے ساتھ ہی اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا جو اُسے پیش آنے والا تھا۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی حامل اقوام مغرب (جنہیں بغرض تعارف امریکن بلاک کہا جاتا ہے)۔ کی طرف سے اس کی مخالفت۔ اس بلاک کی ابلیسیت کا یہ عالم ہے کہ خود ابلیس نے بحضور رب العزت درخواست کی تھی کہ مجھے اب ریٹائر کر دیجئے، کیونکہ

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اس بلاک کے پیش نظر دو مقصد تھے۔ ایک کمیونزم کے سیلاب کی روک تھام اور دوسرے پاکستان میں اس اسلامی نظام کو قائم نہ ہونے دینا، جس کی خاطر اسے حاصل کیا گیا تھا اور جس میں اس بلاک کو اپنی موت نظر آتی تھی۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کو اپنا آلۂ کار بنانا ضروری تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

''دنیا کے خدا پرستو! آؤ ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کریں۔''

جب 1976ء میں پاکستان میں سیرت کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈبلیو، منٹگمری، واٹ، بھی شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے 6 مارچ 1976ء کو اپنے خطاب کے دوران کہا تھا کہ اس وقت نوعِ انسانی اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ایک نہایت نازک صورتِ حال سے دو چار ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے فرزندانِ توحید کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تبلیغ میسر آسکے تا کہ عیسائی اور مسلمان اپنے مشترکہ دشمن ''الحاد'' کے خلاف مل کر جہاد کر سکیں۔

(نوائے وقت، لاہور، مورخہ 7 مارچ 1976ء)

اس ''زیادہ سے زیادہ تبلیغ'' کے لئے اس بلاک نے کیا کچھ کیا اس کے متعلق ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے

جہاں فنڈامینٹل ازم کی تحریک کا ذکر آئے گا۔ سردست آپ ''الحاد و بے دینی کے خلاف جہاد'' کو دیکھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ الحاد اور بیدینی کی مخالفت مسلمانوں کا فریضہ ہے لیکن قرآن تو روس کے انکارِ خدا اور اقوامِ مغرب کے اقرارِ خدا دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے، اور دونوں سے اُس خدا پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس میں فرق کیا اور روس کی لادینی کی مخالفت کو اپنا دینی فریضہ قرار دے لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس قدر یہ جہاد زور پکڑتا گیا، مغربی بلاک کا نظامِ سرمایہ داری اس نسبت سے مستحکم ہوتا گیا۔ یہ اس بلاک کا پہلا مقصد تھا۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اس اسلام کا نفاذ نہ ہونے پائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مذہبی جماعتوں کا تعاون ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں (کالعدم) جماعت اسلامی کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ اس زمانے میں تو اس قسم کی خبروں کو کسی نے چنداں درخورِ اعتنا نہ سمجھا لیکن اب جو ماضی کے ان واقعات پر نگہ بازگشت ڈالتے ہیں تو نظر آجاتا ہے کہ اس جماعت کے امریکن بلاک کے ساتھ شروع ہی سے روابط قائم تھے۔ (مثلاً) روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم دسمبر 1952ء کی اشاعت میں یہ خبر درج تھی کہ:

> ''امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر ڈاکٹر ویلر نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت تھی۔ ان کے ساتھ جماعت اسلامی، لاہور کے راہنما بھی آئے تھے اور مقامی امیر مولانا گلزار احمد تھے۔'' (بحوالہ امروز، مورخہ یکم دسمبر 1976ء)

یہ 1952ء کا ذکر ہے۔ 1955ء میں حکومت پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا تو (مرحوم) مودودی صاحب نے لاہور اور کراچی میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے، کھلے الفاظ میں کہا:

> ''اگر یہ (امریکن) بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں۔۔۔ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت، 16 و 20 دسمبر 1955ء)

ظاہر ہے کہ اس بلاک کو مسلم عوام کا تعاون ان کے نمائندوں کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا تھا۔

ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ روابط قائم ہوئے یا نہیں اور اگر قائم ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی، البتہ یہاں اس قسم کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ امریکہ کی طرف سے یہاں کی مذہبی جماعتوں کو مالی امداد ملتی ہے۔ حتیٰ کہ (اُس زمانہ کی) نیشنل عوامی

پارٹی کے جائنٹ سیکرٹری محی الدین احمد صاحب نے ڈھاکہ کے ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ''جماعت اسلامی'' کو سی۔آئی۔اے کی طرف سے حال ہی میں ساٹھ لاکھ روپیہ ملا ہے اور اس سے پہلے وہ غلافِ کعبہ تیار کرانے کے بہانے۔۔۔پچیس لاکھ روپیہ ہضم کرگئی ہے۔(بحوالہ روزنامہ امروز، مورخہ 14 مئی 1967ء)۔اسی سلسلہ میں مؤقر جریدہ ''چٹان'' لاہور نے اپنی 15 مئی 1967ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:

''غیر ملکی حکومت سے گفتگو کرنے اور اس کے ساتھ روابط پیدا کرنے کا حق صرف اس ملک کی حکومت کو ہوتا ہے۔اگر کسی ملک کی کوئی جماعت اپنے طور پر یہ اقدام کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی نہیں، بلکہ کسی اور ملک کی گماشتہ ہے۔''

اسلام نافذ کرو کا نعرہ:

ہم اس سوال کے سیاسی گوشے سے قطع نظر کرتے ہوئے، اس گوشے کی طرف آتے ہیں کہ جن مذہبی جماعتوں نے مطالبۂ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی انہوں نے یہاں ''اسلام نافذ کرنے'' کے سلسلہ میں کیا کیا۔انہوں نے یہاں آتے ہی یہ مطالبہ شروع کردیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔اس لئے یہاں سب سے پہلا کام اسلام کے نفاذ کا ہونا چاہئے۔اور یہ کام ہم ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ آپ یہاں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ وہ اسلام جس کا تصور اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے پیش کیا تھا، یا وہ اسلام جسے آپ پیش کرتے تھے۔یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے وہی اسلام نافذ کرنا تھا، جسے یہ وہاں پیش کرتے تھے اور جس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کا جواز ہی باقی نہیں رہتا تھا۔انہوں نے جب اپنے مطالبہ پر زیادہ زور دیا تو اعتراض یہ ہوا کہ آپ میں تو اس قدر فرقے ہیں جن میں اس قدر باہمی اختلاف ہے، اس لئے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے! اگر آپ کوئی متفق علیہ فارمولا متعین کرسکیں تو اس باب میں پیش رفت ہوسکے۔اس اعتراض کے جواب میں انہوں نے 1951ء میں مختلف فرقوں کے نمائندگان پر مشتمل (31) علماء کی کانفرنس منعقد کی جس میں قانون سازی کے سلسلہ میں حسب ذیل فارمولا پیش کیا گیا:

(1) پرسنل لاز، ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔اور

(2) ملک کے قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔

یہ بہت بڑا مقدس فریب تھا جو قوم کو دیا گیا۔مقصد اس سے یہ تھا کہ ملکی قوانین کا کوئی ضابطہ مرتب ہو ہی نہ سکے۔تفصیل اس اجمال کی بڑی معنی خیز ہے۔جہاں تک ''کتاب'' کا تعلق ہے، اس سے مراد قرآن مجید ہے جو سب فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔لیکن سنت کی یہ کیفیت نہیں۔یہی نہیں کہ ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے۔سنت کہتے کسے ہیں، اس میں بھی ان کا اختلافِ فہم اور شدید اختلاف کانفرنس میں پاس کردہ فارمولا (کتاب وسنت) پر دستخط کرنے والوں میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم)

اور مولانا محمد اسماعیل سلفی (مرحوم) صدر مرکزی جماعت اہل حدیث، سرفہرست تھے۔ سنت کی (Definition) کے متعلق ان میں جو بحث چلی، وہ مولانا مرحوم کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث'' میں بالتفصیل درج ہے۔ اس کے نمایاں اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ اہل حدیث حضرات کے نزدیک جس کے نمائندہ مولانا سلفی (مرحوم) تھے۔ صحیح احادیث میں جو کچھ آیا ہے، وہ سب کا سب سنت ہے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب (مرحوم) کے نزدیک:

مودودی صاحب کے نزدیک سنت:

''سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں۔ جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی ﷺ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق اور امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔۔۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی ﷺ تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی ﷺ نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور ﷺ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔'' (رسائل و مسائل، حصہ اوّل، ص: 311، 317)

اسی کتاب میں وہ ص: 314 پر لکھتے ہیں:

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی ﷺ پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دُنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں، سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے دینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنت رسول اللہ ﷺ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے

دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرم ﷺ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد تھا کہ:

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً، ص:308)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:

''جو امور آپ ﷺ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔''
(ایضاص:300)

اس پر اعتراض یہ وارد ہوا کہ احادیث کے مجموعوں میں تو اس کی تصریح کہیں درج نہیں کہ حضور ﷺ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول ﷺ فرمائی (یا کی) تھی اور فلاں بات بشری حیثیت سے۔ تو (مودودی صاحب کے اصول کے مطابق) سنت کو متعین کیسے کیا جائے گا۔ اسے کون متعین کرے گا اور اس کے سنت ہونے کی سند کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے کہا کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے:

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔۔۔ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پُرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جوہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔۔۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السنہ مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے، وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی ﷺ کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات، حصہ اوّل، ص:302، ص:324)

مولانا اسماعیل (مرحوم) نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے

قبول کرلے جسے چاہے رد کردے، یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کردے کہ میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت'' دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم ان شاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص:63)

ظاہر ہے کہ جب سنت کی (Definition) میں اختلاف کا یہ عالم ہے۔ تو سنت کا وہ مجموعہ کہاں سے مل سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہوں۔ ان حالات میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ 1951ء میں (31) علماء نے جو متفق علیہ مطالبہ پیش کیا تھا (کہ ملکی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہوں) وہ کہاں تک قابل عمل تھا؟ اس کے باوجود، یہ حضرات (مودودی مرحوم سمیت) بیس سال تک یہ مطالبہ پیش کرتے رہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ تا آنکہ 1970ء میں خود مودودی مرحوم کو اعلان کرنا پڑا:

کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان، ایشیاء، 23 اگست 1970ء)

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال اُبھرا ہوگا کہ جب مودودی (مرحوم) نے محسوس کیا کہ یہ سنت کے پیدا کردہ اختلافات ہیں جن کی وجہ سے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا، تو انہوں نے تجویز کیا ہوگا کہ قانون سازی کا مدار قرآن کو قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں، لیکن توبہ کیجئے، وہ ایسا کس طرح کر سکتے تھے؟ قرآن کے تو نام سے ان حضرات کو چڑ ہے کیونکہ اس سے ان کا رچایا ہوا سارا کھیل ختم ہوجاتا ہے۔ ان لوگوں کو قرآن کے نام سے کس قدر چڑ ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ دو سال اُدھر کی بات ہے، سعودی عرب نے اپنے ہاں ایک نیا دستور رائج کرنے کا فیصلہ کیا اس کے مسودہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیاء نے اپنی 13 اپریل 1980ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:

''ایک اور بات کی جانب بھی ہم توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔۔۔ خبر ہے کہ شہزادہ نائف نے کہا ہے کہ سعودی عرب کا آئین قرآنِ کریم ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ان کا تصورِ قرآن، حدیث سے منقطع نہیں ہے۔ لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کا جو بھی دستور بنے اس میں کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور موجود ہو۔''

مقصد اس سے یہی تھا کہ اسلامی مملکت کی جس اسکیم کو ہم یہاں ناکام بنا چکے ہیں۔ وہ کہیں سعودی عرب میں کامیاب نہ ہوجائے۔

بہرحال جب مودودی (مرحوم) نے کہا کہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں کیا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کردی جائے۔ یعنی وہ فقہ جس کے متعلق ان کے اپنے نظریات یہ تھے:

1۔ مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان ومکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا۔ نہ اُس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات، حصہ دوم، ایڈیشن 1951ء، ص:426)

2۔ یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔ (ایضاً)

3۔ بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جاسکتے ہیں اور نہ سب کے سب دریا برد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔

(رسائل ومسائل، جلد دوم، ایڈیشن، ستمبر 1964ء، ص:282)

4۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن، محرم 1360ھ)

5۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ اور جب میرا ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور وفکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

6۔ میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل ومسائل، حصہ اوّل، ستمبر 1951ء، ایڈیشن، ص:235)

7۔ میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔

(ایضاً، ص:244)

8۔ ایک صاحبِ عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوسکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔۔۔ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ بزرگوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ (تنقیحات، پانچواں ایڈیشن، ص:150، 151)

9۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (ایضاً، ص:130)

فقہ کے متعلق مودودی صاحب مرحوم کے ان نظریات کے ساتھ اُن کے اس مطالبہ کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔

فقہ حنفی کو حنفی (سُنی) فرقہ کے سوا کوئی فرقہ بھی من وعن اسلامی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب سے عدم دلچسپی کی انتہا ہے کہ جب

مودودی مرحوم نے یہ تجویز کیا کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کردی جائے تو کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ آپ نے کتاب وسنت کے فارمولا کو اس لئے مسترد قرار دے دیا تھا کہ اس کی رُو سے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں، تو جو ضابطۂ قوانین فقہ حنفی کے مطابق مرتب ہوگا، کیا اُسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں گے؟ کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا، حتیٰ کہ ان مذہبی فرقوں نے بھی، جو چھوٹے چھوٹے (فروعی) مسائل کے اختلاف پر حنفیوں سے اُلجھتے رہتے ہیں اور ان کے اختلافی جھگڑے پولیس اور عدالتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ خود حکومت نے بھی اس سوال کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور فقہ حنفی کو قانون سازی کا مدار تسلیم کرلیا، اس بے اعتنائی کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ جب زکوٰۃ سے متعلق قانون پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ کیا گیا تو شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف ایسا شدید عملی احتجاج ہوا کہ حکومت کو یہ قانون بدلنا پڑا اور ہر فرقہ کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔ (قرآنی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی البتہ اجازت نہیں دی گئی) یہ حشر ہوا پہلے ہی پبلک لاء کا۔ جہاں تک سزاؤں (حدود) سے متعلق نافذ کردہ قوانین کا تعلق ہے خود صدرِ مملکت نے ایک سے زیادہ بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے چند ہی روز بعد صدر مملکت (ضیاء الحق) نے امریکہ کی (C.B.S) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں (ان کے اس اعتراض کے جواب میں کہ یہ سزائیں بڑی وحشت ناک ہیں) کہا تھا کہ:

> یہ ٹھیک ہے لیکن میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام سزا کے بجائے تخویف پر زور دیتا ہے۔ اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اُس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جارہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جاسکیں گی۔
>
> (پاکستان ٹائمز، 19 فروری 1979ء)

صدرِ مملکت نے، اواخر نومبر 1981ء میں، ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے میگزین ایشیاء ویک (Asia week) کو انٹرویو دیا جس میں انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں شرعی حدود کے متعلق قوانین تو نافذ کردیئے گئے ہیں لیکن ان کے مطابق کسی کو سزا نہیں مل رہی۔ فرمایا کہ:

> یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کرسکتے۔ قرآنی قانون کا فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے ہاں ایسی قوت ہونی چاہئے جو لوگوں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مل سکیں جو شہادت دیں کہ انہوں نے جنسی اختلاط کے وقت عمل دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ ایسا ناممکن (Impossible) ہے۔ (ایشیاء ویک، بابت 4 دسمبر 1981ء)

آپ نے غور فرمایا کہ یہاں اسلام کو کس طرح ایک عضو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے؟ اس کے باوجود چرچا کیا جارہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا احیاء ہورہا ہے۔ پاکستان کے مخالفین (اور اقبالؒ کی نگہ دوررس کے مطابق) اقوامِ مغرب دونوں کا یہی منشاء تھا۔

نظامِ سرمایہ داری:

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کی نظامِ سرمایہ داری کی علمبردار قوتوں نے ''خدا پرستوں'' (یعنی مسلم اقوام) کو جو دعوتِ اتحاد و تعاون دی تھی تو اس سے کمیونزم کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا مقصود تھا۔ مودودی مرحوم نے اسی لئے ان سے کہا تھا کہ تمہارا یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ تم مسلم ممالک کے حکمرانوں کے بجائے یہاں کے عوام سے رابطہ قائم کرو۔ یہ رابطہ کس طرح قائم ہو اس کی تفصیل میں جانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ لیکن مودودی (مرحوم) نے اسلام کا جو معاشی نظام پیش کیا وہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابق اسلام ثابت کرنے کے لئے کس قدر کوشش کی۔ اس نظام کو انہوں نے اپنی کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:

''اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔''

(مسئلہ ملکیتِ زمین، پہلا ایڈیشن، 1950ء، ص:52، 53)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دُنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید

نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

(ایضاً، ص:72، 73)

یہی نظام اس وقت یہاں رائج ہے جسے اسلامی کہنے کے لئے فقہ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ دولت کا انبار در انبار جمع کرنا عین مطابقِ اسلام ہے بشرطیکہ اس میں سے چند پیسے بطور ''زکوٰۃ'' ادا کر دیئے جائیں۔ ربوٰ کا نام (جسے قرآن نے ''خدا اور رسول'' کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے)۔ منافع رکھ دیا گیا ہے، خواہ وہ بینکوں میں جمع کردہ رقوم پر ہو، اور خواہ کاروبار میں (Sleeping Partner) کے طور پر جس کے لئے فقہ کی اصطلاح مضاربت اختیار کر لی گئی ہے۔ زمین پر بے حد و نہایت ملکیت جائز ہے بشرطیکہ اس سے ''عُشر'' ادا کر دیا جائے۔ اس قسم کے منافع کو مزارعت کہہ دیا گیا ہے۔ یہ نظام سرمایہ داری کی وہ شدید شکل ہے جس میں اب خود نظامِ سرمایہ داری کی حامل اقوامِ مغرب بھی لچک پیدا کرتی جا رہی ہیں۔ یہاں اسے اسلام کے معاشی نظام کے نام سے رائج اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ یہی اقوامِ مغرب کا منشاء تھا۔

فنڈامینٹل ازم:

ہندو، ہماری مذہبی پیشوائیت اور اقوامِ مغرب کی یہ تثلیثی سازش آہستہ آہستہ زمیں گیر ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سُست تھی اور اقوامِ مغرب یہ خطرہ محسوس کر رہی تھیں کہ ان کی یہ آہستہ خرامی رفتہ رفتہ جمود کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع شدہ ''اسلام'' کی شراب کہن کو نئی بوتلوں میں اس طرح بند کیا جائے کہ اصلی اور نقلی میں فرق نہ کیا جا سکے۔ اس نئی تحریک کا نام انہوں نے (Funda Mentalism) رکھا جس کے لغوی معنی ''بنیادی اسلام'' کے ہیں۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر عام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں ہی نہیں، یورپ، امریکہ، کینیڈا تک میں ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کر دی گئی ہیں، اور وہاں کے نامور مذہبی پیشوا اور قدامت پسند پیشہ وران کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روپے کے سیلاب کے بند اس طرح کھول دیئے ہیں کہ سب اس میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ جس اسلام کو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا لیکن اس کے لئے اسلوبِ بیان ماڈرن اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے ''ہمارا وہ طبقہ جو مولویوں سے متنفر تھا ان کی باتیں کان لگا کر سنتا ہے، حالانکہ ان کی باتیں بھی وہی ہوتی ہیں جنہیں مولوی صاحبان پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ تحریک روپے کے زور اور

پراپیگنڈہ کے شور سے کامیاب ہورہی ہے۔خواص کی نگاہوں میں ''ماڈرن ازم'' کی چمک سے اس قدر خیرگی پیدا کی جارہی ہے کہ ان میں حقیقت اور فریب میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، اور عوام کے لئے مذہب کی رسمی تقریبات کو اس قدر پُرکشش، بارونق اور مقدس بنایا جارہا ہے کہ وہ سامریت کے اس دامِ ہمرنگِ زمین سے نکل ہی نہیں سکتے۔

یہی تھا وہ نظام جس کی محکمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ''شعبۂ اسلام'' کے مشیر نے کہا تھا کہ ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام — پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا؟ — کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ارمغانِ حجاز، ص:215،216)

اور اس میں تحریکِ پاکستان کے مخالفین اور اقوامِ مغرب واقعی کامیاب ہیں۔

پاکستان کا مقصد:

یاد رکھئے! جس مملکت کے قیام کا تصور اقبالؒ نے دیا تھا اور جس کے لئے قائداعظمؒ کی سعی پیہم کے تصدق ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا، اسے اپنی مقصدیت کے اعتبار سے اسلامی مملکت بننا تھا۔ وہ مقصدیت یہ تھی کہ اس میں:

1۔حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں ہوگا۔حکمرانی صرف کتابِ اللہ (قرآن) کی ہوگی۔

2۔اس میں غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز، اسلامی اور غیر اسلامی کی سند اور اتھارٹی قرآن مجید ہوگا۔

3۔اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔خوف ہوگا تو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے مضرت رساں نتائج کا جن کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوگا۔

4۔اس میں نہ کوئی فرد رات کو بھوکا سو سکے گا۔نہ کسی کی کوئی ضرورت رُکی رہے گی۔

5۔اس میں امیر اور غریب، محتاج وغنی، حاکم ومحکوم کی تمیز نہیں ہوگی۔تمام انسان یکساں واجب التکریم ہوں گے اور تذلیل وتوہینِ آدمیت سنگین ترین جرم ہوگا۔

6۔اس میں وہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے گا، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود۔اُمت کے باہمی مشورہ سے نظامِ حکومت قائم ہوگا اور وہ نظام قرآن مجید میں متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قواعد و ضوابط خود مرتب کرے گا۔انہی کو احکامِ شریعت کہا جائے گا۔

7۔اس میں ساری اُمت، اُمتِ واحدہ ہوگی جس میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوگا۔

یہ تھا وہ نظام جسے قائم کرنے کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے مخالفین کی انتہائی کوشش تھی کہ اوّل تو یہ خطۂ زمین ہی حاصل نہ ہو، اور اگر حاصل ہو بھی جائے تو اس میں یہ نظام قائم نہ ہو سکے (جسے الدین کہا جاتا ہے)۔ اس کے بجائے اس مذہب کا دور دورہ ہو جس سے انسان نہ دین کا رہتا ہے، نہ دُنیا کا، اقبالؒ کے الفاظ میں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ؎

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا تھا:

''ہماری حفاظت، ہماری نجات اور عزت وآبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا۔ نہ اسلام کا نام ونشان۔''

(تقاریر، جلد دوم، ص:255)

اگر قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ پاکستان مل جانے کے بعد بھی اس اسلام پر کیا بیت رہی ہے جس کے احیاء کے لئے انہوں نے پاکستان لے کر دیا تھا۔

بہرحال، ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم اس میں ناکام رہ گئے اور پاکستان کے مخالفین کامیاب ہو گئے۔ یہ بدقسمتی ہماری ہی نہیں۔ پوری کی پوری انسانیت کی بدقسمتی ہے کیونکہ پاکستان نے اس نظام کی تجربہ گاہ بننا تھا جس سے نوعِ انسان نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا۔ اس اعتبار سے ہم اپنی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم ہیں اور عالمگیر انسانیت کی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم، ہزار سال کے بعد یہ نادرِ روزگار موقعہ ہمیں میسر آیا تھا ہم نے اسے بُری طرح کھو دیا۔ اے وائے ما!! اے وائے ما!!

جبیں را پیش غیر اللہ سودیم — چو گبراں در حضورِ او سرودیم
ننالم از کسے، می نالم از خویش — کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

(ارمغانِ حجاز، ص:51)

مجھ سے اکثر تقاضا کیا جاتا ہے کہ میں اقبالؒ کے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی پیش کر دیا کروں۔ میں ان اشعار کا ترجمہ کیا کروں؟ یہ تو اپنی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا ماتم کرنا ہے۔ ہر چند کہ ماحول کی افسردگی طبیعت کو اس طرف آنے نہیں دیتی لیکن غالب نے اس مفہوم کو اپنے شوخ وشنگ انداز میں جس طرح ادا کیا ہے اس سے بات سمجھ میں آجائے گی اُس نے کہا ہے:

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد — آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے!
غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

جن رفعتوں اور عظمتوں کا آئینہ دار وہ اسلام تھا جس کے لیے ہمیں یہ خطہ زمین عطا ہوا تھا اس اسلام کو نافذ کرنے والے

انسان بھی اتنے ہی بلند اور عظیم ہونے چاہئیں تھے۔ ہمارے جیسے پست قامت ان بلندیوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تھے، اس لیے ہم اس نعمت کبریٰ کے اہل نہیں قرار پائے۔ جو تیشۂ فرہاد اُٹھانے کی ہمت نہ رکھتا ہو، اسے جوئے شیر کیسے مل سکتی ہے؟ ہمیں اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنی چاہئے تھی۔ قرآن کریم نے ''اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ'' (تم سب پر غالب آجاؤ گے) کے لئے اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔ (اگر تم مومن ہوتے) کی شرط عائد کی تھی۔ ہم نے اس شرط کو پورا نہ کیا تو اس مقام تک پہنچ نہ سکے۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ دُہرائی جارہی ہے۔ فرعون کی غلامی میں وہ ضعف و بیچارگی کی انتہا تک پہنچ گئے تو مشیتِ خداوندی نے اُن کی حالت پر رحم کھایا اور چاہا کہ انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوجائے۔ (5-38:6)۔ اس کے لئے انہیں ایک خطہ زمین عطا کردیا گیا۔ (قرآن کے الفاظ میں) اسے ان کے نام لکھ دیا۔ (5:21) لیکن جب وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تو تقدیر امم کے اٹل قانون کی رُو سے فیصلہ ہوا کہ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ (5:26)۔ جس زمین کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا گیا تھا، اس سے انہیں محروم کردیا اور کہہ دیا کہ وہ چالیس سال تک خانہ بدوشوں کی طرح صحرانوردی کریں اور اپنے اندر تمکن فی الارض کی صلاحیت پیدا کریں۔ خدا کرے کہ ہمارے جرائم کی سزا ابدی محرومی نہ ہو۔ وقتی ہو اور جس طرح بنی اسرائیل کی اُس نسل کے بعد آنے والے مؤرخ نے اُسی سرزمین میں سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کا نظارہ کیا تھا، ہمارا آنے والا مورخ بھی اُس نظام کی جنت آفرینیوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جس کے لئے یہ خطۂ زمین ہمیں عطا کیا گیا تھا۔ اُس کی رحمتِ بے پایاں نے، جنت سے نکلے ہوئے آدم کو جنت کی بازیابی کا وعدہ بھی تو دلایا تھا۔ لیکن یہ جنت مفت میں نہیں مل جانی تھی۔ اس کے لئے فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ (2:38) کی شرط لازم تھی۔ اس طرح حاصل کردہ جنت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عملِ تست، جناں چیزے ہست

مفہوم: وہ بہشت جو تمہیں (بھیک میں) بخشی گئی ہو، کسی کام کی نہیں۔ وہ جنت جو تمہاری جدوجہد اور محنت کے نتیجے میں وجود میں آئے، اس کی کیا بات ہے۔

ہمیں یہ خطۂ زمین ملا ہی اس لیے تھا کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14)۔ ''ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟'' ہم نے جس قسم کے کام کئے اُسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آگیا۔ یہاں تو

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

لیکن مجھے تو داستانِ بنی اسرائیل کو اپنے حال پر منطبق کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ ان کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ اس کی تمکن فی الارض سے عارضی محرومی کے بعد، نئی نسل کے نوجوان (حضرت) موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور ان کے جوشِ کردار نے مخالفت کے ہر بند کو توڑ کر تمکن حاصل کرلیا۔ لیکن ہماری نئی نسل کو تو اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ اسلام کے نام تک سے متنفر ہورہی ہے۔ اس کا اگلا قدم سیکولرزم ہوگا۔ اُس وقت بھارت کا ہندو مسلمانوں کی وہ تمام جماعتیں جنہوں نے

مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور اقوامِ مغرب اپنی اس کامیابی پر جشنِ مسرت منائیں گی کہ:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مفہوم: بلا سر پر آ گئی تھی لیکن شکر ہے ٹل گئی!

اس سے اُن کے دل پر کیا گزرے گی جنہوں نے اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام کا خواب دیکھا تھا، اس کی بابت مت پوچھئے۔ خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

لیکن اس کے باوجود، جب تک میرے دم میں دم ہے مَیں قرآن کی آواز بلند کئے جاؤں گا کہ میرے سامنے اُس کا یہ وعدہ موجود ہے جو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، کہ اس نظام کو دُنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ یہاں نہ سہی کہیں اور سہی۔

1۔ محفلِ ما بے مے و بے ساقی است سازِ قرآں را نوا ہا باقی است

2۔ زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ در

3۔ حق اگر از پیشِ ما بردارد ش پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

4۔ ترسم از روزے کہ محرومش کنند آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ، ص:91)

ترجمہ:

1۔ ہماری محفل شراب اور ساقی کے بغیر ہے، مگر قرآن کے ساز کے نغمے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

2۔ اگر ہماری مضراب میں کوئی اثر نہیں رہا تو آسمان کے پاس ہزاروں اور ساز ندے موجود ہیں۔

3۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے (قرآن کو) ہمارے سامنے سے اٹھالے تو وہ اسے کسی اور قوم کے سامنے رکھ دے گا۔

4۔ میں اس دن سے ڈرتا ہوں کہ مسلمان کو قرآن سے محروم نہ کر دیا جائے۔ اور مولا کریم اپنے عشق کی آگ کسی اور کے دل پر نہ ڈال دے۔

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ حیات قرار دیا ہے، اس لئے اس کا نظام نہ کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہے۔ نہ کسی خاص قوم تک محدود، اور نہ کسی خاص زمانے سے مختص۔ جو قوم جس ملک اور جس زمانے میں بھی اس کے حقائق پر علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رُو سے غور کر کے انہیں اختیار کر لے گی وہ اس سے فیضیاب ہو جائے گی۔ مذہب پرست قومیں جو اپنی خوش فہمیوں میں مست اور توہم پرستیوں میں مطمئن رہتی ہیں ان کے حصے میں یہ سعادت نہیں آ سکے گی۔ دانش ورانِ مغرب، اپنے موجودہ نظامِ حیات سے تنگ آ کر ایک نئی دُنیا اور اس میں ایک جدید نظام کی تلاش میں ہیں۔

ایک ایسی دنیا جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں

شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مُراد ساری دنیا کی واحد حکومت ہوگی۔ جو جمہوری طور پر تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دُنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

(Beyond the welfare state, By. Gunner Myrdal)

یہ دُنیا ایک ایسے مذہب کی رہین منت ہوگی:

''جو انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و فکر پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اُسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔''

(The Sane Society; by Erich Fromm)

ہم نے اس مقام پر دانش ورانِ مغرب میں سے صرف دو ایک کے خیالات پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب اپنی نیشنلزم کے ہاتھوں نالاں ہیں کہ دُنیا میں جنگوں کے لامتناہی سلسلہ کا بنیادی سبب یہی ہے۔ وہ اپنے ہاں کی جمہوریت سے تنگ آ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بھی ملوکیت ہی کا پرتو ہے۔ مغربی سرمایہ پرست قومیں اپنے معاشی نظام کو عالمگیر تباہی کا موجب قرار دیتی ہیں۔ اس کے برعکس روس اور چین کی سوشلزم بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اس حصہ لا کے بعد جب وہ الا (مثبت نظام) کے متعلق سوچیں گے تو وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔ اس طرح ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

والسلام

توجہ فرمایئے

اس امر کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ ادارہ طلوع اسلام کا ملکی یا غیر ملکی کسی بھی سیاسی پارٹی یا فرقہ سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی ادارہ طلوع اسلام خود کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ ہے۔ یہ صرف اور صرف ایک فکری اور علمی تحریک ہے۔ (چیئرمین ادارہ)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چینی نظام اور ریاستِ مدینہ کے درمیانی فاصلے

مشہور اخبار ''THE DAWN'' کی 9 جنوری 2019ء کی اشاعت میں مشہور سینئر صحافی محترم جناب زاہد حسین صاحب کا ایک بڑا پُر معنی مضمون بعنوان Learning From China شائع ہوا ہے۔ یہ بڑا علمی اور غور طلب مضمون ہے۔ اس مضمون میں جناب زاہد حسین صاحب نے چینی انقلابِ چین کی ترقی کی وجوہات بیان کی ہیں جو بالکل حقائق پر مبنی ہیں۔ خود چین جا کر یا یہاں پاکستان میں ہی رہ کر چینی لٹریچر پڑھ کر ہر شخص ان حقائق کی تصدیق کر سکتا ہے۔ انہوں نے چین کی ترقی کے اصل، اسباب، چین کا سیاسی استحکام، معاشی ترقی اور بلند معیارِ زندگی کو قرار دیا ہے۔ مضمون طویل ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا اردو ترجمہ کر کے پھر اس پر تبصرہ تحریر کیا جائے۔ لیکن چونکہ وہ مضمون طویل ہے، اس کو ہم اپنے مضمون میں شامل نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس کا ملخص تحریر کر دیا ہے۔

وزیر اعظم عمران خان صاحب بار بار ریاستِ مدینہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس ریاست کو بطور ایک نمونہ کے پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی علیٰ الاعلان چین کے نظام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ کبھی انہوں نے چینی نظام کو بطور ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ البتہ اخبارات میں ایسی اطلاعات آئی ہیں کہ پاکستان کی ایک مختصر سی ٹیم چین میں ٹھیر کے ان کے نظام کا جائزہ لے رہی ہے۔ چین کا انقلاب اور اس کی ترقی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس لئے ہر شخص اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ریاستِ مدینہ آج سے 14 سو سال پیشتر قائم ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی قائم نہیں ہوئی اس لئے عام لوگ اس کو Appreciate نہیں کر سکتے۔ خلافتِ راشدہ کے انقراض کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ محترم عمران خان صاحب نے ریاستِ مدینہ کا ذکر کیا ہے۔ ماضی قریب میں ایران میں امام خمینی نے بڑی جدوجہد اور بہت قربانیوں کے بعد اسلامی ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن وہ اسلامی ریاست نہیں تھی۔ ہمیں ایرانی انقلاب سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ اور یہ خدشہ تھا کہ ایران کے اسلامی انقلاب کے ناکام ہونے سے مسلمانوں پر بہت بڑا اثر پڑے گا اور کئی صدیوں تک پھر مسلمانوں کو اقامتِ دین کا حوصلہ نہیں رہے گا۔ ہمارا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ ایران کے انقلاب کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایران کی تقریباً پوری آبادی شیعہ ہے اور تشیع میں اسلامی ریاست کا تصور ہی نہیں ہے۔ یہ جو خمینی صاحب نے ایران میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی تھی وہ

تشیع کے بالکل خلاف تھی شیعت کا نظام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ چونکہ اس رسالہ کا کوئی تعلق کسی فرقہ سے نہیں ہے یہ کسی فرقہ کے متعلق کچھ تحریر نہیں کرتا۔ اس لئے ہم اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ تحریر کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ اگر شیعہ حضرات کا کوئی رسالہ ہمیں دعوت دے گا تو ہم اس کے لئے ایرانی انقلاب کی ناکامی کی وجوہات بیان کر سکتے ہیں۔

پاکستان 1947ء میں وجود میں آیا تھا اور چین کو اس سے دو سال بعد 1949ء میں آزادی ملی تھی۔ اس کے بعد وہاں انقلاب آیا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس عرصہ میں پاکستان نے کوئی ترقی نہیں کی۔ آج کا دور ایوب خاں کے دور سے بھی بدتر دور ہے۔ ایوب خاں کے دور میں دہشت گردی اور کرپشن اس درجہ نہیں تھی اور کم سے کم سرکاری Exchequer محفوظ تھا۔ یہاں کے لیڈروں نے پاکستان میں خاک ہی اڑائی۔ اس کے برخلاف چین نے بڑی ترقی کی۔ جب آپ کسی عالم یا کسی بھی مذہبی آدمی کے سامنے پاکستان کا مرثیہ پڑھتے ہیں تو وہ فوراً یہ کہتے ہیں کہ جی مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا، نماز پڑھنی چھوڑ دی، اس وجہ سے مسلمانوں پر بربادی آئی ہے سوال یہ ہے کہ جب سب پاکستانی مسلمان قرآن کو وحیٔ الٰہی مانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جب قرآن پر عمل کیا گیا تھا تو ایک ایسا عمدہ نظام وجود میں آیا تھا کہ اس جیسا نظام پھر دوبارہ وجود میں نہیں آیا۔ یہ دونوں باتیں ماننے کے باوجود قرآن کو کیوں چھوڑا، نماز پڑھنا کیوں ترک کی۔ اگر قرآن چھوڑنے سے قوم ذلیل ہوتی ہے تو چین نے کون سا قرآن پکڑ رکھا ہے۔ وہ تو نماز بھی نہیں پڑھتے اور کیا کوئی قوم نماز پڑھنے اور پرستش کرنے سے بلند درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ یہ بات بڑی غور طلب ہے اور اگر قرآن پر عمل کرنے کے نتائج سامنے ہیں تو اب قرآن کو دوبارہ پکڑنے میں کیا چیز مانع ہے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام اقامت دین کی داعی ہے اور سمجھتی ہے کہ اقامت دین کے بعد یہ نتائج سامنے آئے تھے اور اب مسلمانوں نے قرآن کو یوں چھوڑا کہ نتائج سامنے نہیں آ رہے تھے۔ تحریک طلوعِ اسلام کو وزیراعظم عمران خاں کے ریاست مدینہ کے قیام کے اعلان سے بہت خوشی ہوئی۔ لیکن تحریک طلوعِ اسلام جناب عمران خان صاحب یا ان کی تحریک انصاف سے کوئی توقع وابستہ نہیں کرتی۔ کیونکہ عمران خاں صاحب کے جو بیانات سامنے آ رہے ہیں اُن سے واضح ہو رہا ہے کہ اُنہیں یا ان کی جماعت کو، اس بات کا علم نہیں ہے کہ ریاستِ مدینہ کیا ہوتی ہے اور وہ کس طرح قائم کی جاتی ہے۔ ان کے بیانات کے ذریعے ان کے جو نظریات معلوم ہو رہے ہیں وہ سب اقامت دین کے خلاف ہیں۔ ہمارے علماء کرام ہی وہ ہیں جو اقامت دین میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی، مصر کی اخوان المسلمون یہ تینوں جماعتیں اقامتِ دین کی داعی ہیں۔ لیکن ان تینوں جماعتوں کے عقائد وہ ہیں جو اقامتِ دین اور خود قرآن کے خلاف ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے انقراض کے بعد سے تا ایں سیاہ دوران، تحریکِ طلوعِ اسلام وہ واحد تحریک ہے جو قرآن کے مطابق اقامتِ دین کی داعی ہے۔ اس دعویٰ کی تفصیل آگے پیش خدمت عالی کی جائے گی۔

ہمیں عمران خاں صاحب سے اس وقت سے محبت ہے جب وہ کرکٹ کے کھلاڑی تھے اور ساری دنیا میں پاکستان کا نام

روشن کررہے تھے اس کے بعد ہماری محبت میں اس وقت اضافہ ہوا جب انہوں نے قرآن کریم کی طرف رخ کیا اور قرآنِ کریم کا نام لینا شروع کیا۔ لیکن اس محبت کے باوجود ہم ان کی اس خامی کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ وہ جذباتی، سطح بین، توہم پرست اور Scatterd ideas کے حامل ہیں۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور اس وجہ سے نہیں ہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں اور خصوصاً ہماری پیشوائیت کے نظریات ہی قرآن کے خلاف ہیں، تو ان کی، قرآن کے درست نظریات تک کیسے رسائی ہوسکتی ہے۔

عقلِ انسانی نے بھی اچھے معاشرے تشکیل دینے میں ترقی کی ہے۔ انسانیت کے بالکل ابتدائی دور میں قبائلی سسٹم قائم تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ترقی کی اور اب مغربی اور خصوصاً Scandinavian ممالک کی حکومتیں بہت اچھی شمار ہوتی ہیں۔ ان میں شہریوں کی تمام ضروریات پوری کردی جاتی ہیں۔ اسی طرح چین نے بہت ترقی کی جب یہ 1949ء میں قیامِ پاکستان کے دوسال بعد آزاد ہوا، تو اس کی حالت ہم سے بھی بدتر تھی۔ لیکن صرف عقل انسانی کے زور پر اس نے بہترین معاشرہ قائم کرلیا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب عقل انسانی کے ذریعے بہترین نظام قائم کیا جاسکتا ہے تو پھر اسلام کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اور پھر ریاست مدینہ قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ وہ روح کی پرورش کے لئے مسلمان ہوئے ہیں اور اسلام اختیار کرنے سے روحانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان کی زندگی کا مقصد روحانیت میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن روحانیت حاصل کرنے کے لئے کسی نظام کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ روحانیت کا اضافہ تو پرستش کرنے سے ہوتا ہے۔ لیکن پھر وہی سوال ہوتا ہے کہ پرستش تو ہر جگہ ہوسکتی ہے اور اس کو مذہب کہتے ہیں ہمارے علماء مذہب کے قائل ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے انقراض کے بعد سے مسلمان مذہب پر ہی عمل کررہے ہیں ہمارے علماء نے کبھی اقامت دین کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ قرآنِ کریم قرآن کے نظام کو دین کہتا ہے (3:19)، اور اللہ کے نزدیک اسلام ہی وہ دین ہے جو قابل قبول ہے، اللہ کے نزدیک اسلام کے علاوہ کوئی دین قابل قبول نہیں (3:85)۔

ہماری دقت یہ ہے کہ ہم اسلام کو چھوڑ کے انسانوں کا وضع کردہ نظام بھی اختیار نہیں کرتے اور علی الاعلان مذہب کو بھی رد نہیں کرتے اور دین کی طرف آنا بھی نہیں چاہتے۔ مذہب اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق ہوتا ہے۔ اس کا وجود صرف انسان کے ذہن میں ہوتا ہے ذہن کے باہر خارج میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ سے یہ تعلق پرستش کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے اور دل کو یہ اطمینان دلا دیا جاتا ہے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوگیا ہے مذہب صرف انفرادی اور داخلی جذبہ ہوتا ہے جس کے لئے کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مذہب میں پرستش کے نتائج مرنے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ پرستش کے نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے اس کے برخلاف دین ہوتا ہے۔ دین ایک نظام ہوتا ہے۔ جو ایک بہت مضبوط اساس پر قائم ہوتا ہے۔ دین کو موجودہ دور میں ریاست کہا جاتا ہے۔ اسلام دین ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ (3:19) اللہ کے نزدیک ضابطۂ حیات اسلام ہے۔ خدا کے تمام انبیاء (علیہم السلام) دین لے کر آتے

تھے(2:213، 44 :5)ان کے بعد ان کے پیرو اس کو مذہب میں تبدیل کر دیتے تھے رسول اللہ ﷺ بھی دین لیکر آئے تھے(9:33، 48:28)انہوں نے اس کو قائم بھی کیا تھا۔اس کے بہترین نتائج اس دنیا میں سب کے سامنے آئے۔یہ نظام اب بھی قرآن میں محفوظ ہے۔اس نظام میں ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں پر حکومت کرے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ترجمہ: حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾، وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾، وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ (5:44، 5:45، 5:47) ترجمہ: جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ظالم اور فاسق ہیں۔ کتاب تو ایک ضابطۂ حیات ہے۔اس کی اطاعت ایک زندہ اتھارٹی کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔جو ریاست قرآنِ کریم کے قوانین واحکامات کو جاری کرتی ہے وہ ریاست مدینہ کہلاتی ہے۔حضور ﷺ کو حکم ہوا فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) ترجمہ: تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کر۔اس ریاست کے نافذ کردہ احکامات کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہوتی ہے۔یہی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔قرآنِ کریم میں جس جگہ بھی اللہ ورسول کی اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد اسی حکومت کے احکام کی اطاعت ہے۔اگر یہ قرآنی حکومت قائم ہے تو اللہ ورسول کی عبادت ہو رہی ہے۔اگر یہ قائم نہیں ہے تو آپ سمجھ لیں کہ اللہ ورسول کی اطاعت نہیں ہو رہی۔دین میں اطاعت اجتماعی طور پر ہوتی ہے البتہ مذہب میں اطاعت انفرادی طور پر ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ کے جو وعدے قرآن کریم میں آئے ہیں کہ مسلمان ہمیشہ غالب رہیں گے (58:21) بلند رہیں گے(3:139) اللہ کافروں کو مسلمانوں پر کبھی غلبہ نہیں دے گا(4:141) وہ سارے دعوی اس نظام میں پورے ہوتے ہیں۔جب تک مسلمان دین کا نظام اختیار نہیں کریں گے اور مذہب کے اندر رہیں گے وہ کبھی قعرِ مذلت سے نہیں نکل سکتے۔مسلمان ہونا کوئی فکری یا ذہنی چیز نہیں ہے مسلمان ہونا ایک عملی چیز ہے۔مسلمان وہ ہوتا ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے تمام نظام باطل پر مبنی ہوتے ہیں اور صرف اللہ کا دیا ہوا نظام ہی حق پر قائم ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اصل بات پیشِ خدمت عالی کی جاتی ہے کہ جس وجہ سے اسلامی ریاست قائم کرنا ضروری ہوتا ہے تمام سیکولر حکومتیں اور چین کی حکومت بھی مقصود بالذات قائم کی جاتی ہیں۔ان تمام کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ملک میں امن وامان قائم ہو،شہریوں کو ہر طرح کے رزق اور رہائش کی سہولتیں موجود ہوں۔ہر بچہ کو عمدہ ترین تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوں۔یہ ان حکومتوں کا مقصود ہوتا ہے۔لیکن ریاست مدینہ مقصود بالذات نہیں ہوتی وہ ایک خاص مقصد حاصل کرنے کے لئے قائم کی جاتی ہے اور یہ ریاست صرف وہ لوگ ہی قائم کرتے ہیں جن کو وہ مقصود حاصل کرنا درکار ہو۔ان لوگوں کے علاوہ دیگر لوگ یہ ریاست قائم نہیں کرتے اس مقصود کی تفصیل آپ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

میں آپ سے مصروف گفتگو ہوں۔کسی نے آکر مجھے اطلاع دی کہ کل میرا بیٹا لندن سے آرہا ہے۔یہ خبر سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔تھوڑی دیر بعد باہر کسی نے پستول چلائی اور مجھے کسی کے بلند آواز سے رونے کی آواز سنائی دی۔تو میں گھبرا گیا میرا

یہ خوش ہونا، اور میرا یہ گھبرانا، ان دونوں چیزوں کا، میرے جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ میرا ہاتھ خوش ہوا اور نہ ہی میرا پاؤں گھبرایا۔ میری یہ چیز جو پہلے خوش ہوئی اور تھوڑی دیر بعد گھبرائی یہ میری ذات، یہ میرا نفس ہے۔ اس چیز کے موجود ہونے پر ہر مسلمان ایمان لاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس چیز پر ایمان نہیں لاتا تو وہ مسلمان شمار نہیں ہوسکتا یہ ایک توانائی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی۔ اس توانائی کی کوئی Definition نہیں ہوسکتی۔ یہ توانائی ہی انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے اور انسان کو ارادہ و اختیار دیتی ہے۔ اس توانائی کی وجہ سے انسان اپنے افعال و اعمال کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے اور اسی کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوتا ہے۔

اس توانائی کے ملنے کو قرآن کریم میں ''نفخ روح'' کہا گیا ہے۔ یہ ''نفخ روح'' قرآن کریم کی ایک اصطلاح ہے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر تین مقامات پر آیا ہے (15:29، 32:9، 38:72) جب تک اس توانائی کی نسبت اللہ تعالیٰ تک رہی تو قرآن نے اس توانائی کو روح کے لفظ سے موسوم کیا اور جب یہ توانائی انسان کو عطا ہوگئی تو قرآن کریم نے اس کو ''نفس'' یا ''ذات'' کہنا شروع کر دیا۔ ہمارے علماء کرام ''روح اور نفس'' کے اس امتیاز کو Miss کر گئے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا قائل ہے لیکن وہ روحِ انسانی کا منکر ہے یہ بات قرآن کی وحی الٰہی ہونے کا بڑا واضح ثبوت ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے وقت سے، اس دور تک سب لوگ روحِ انسانی کے قائل چلے آرہے ہیں۔ آپ اس توانائی کو علماء کے نظریہ کے مطابق روح کہیں یا قرآنِ کریم کے مطابق نفس کہیں، لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس توانائی کو پرورش کرنا، اس کو ترقی دینا اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ علماء کے نزدیک آدمی ''جسم و روح'' کا مرکب ہے اور قرآن کے مطابق آدمی ''جسم اور نفس'' کا مرکب ہوتا ہے۔

پرورش تو دونوں کی کرنی مقصود ہے۔ فرق یہ ہے کہ چونکہ قرآن ''روح انسانی'' کا قائل نہیں اس لئے اس نے روحِ انسانی کی پرورش کے اصول بھی بیان نہیں کئے ہمارے علماء اور صوفیاء نے اس کی پرورش کے جو اصول بتائے وہ قوم کو غارت و برباد کرتے ہیں۔ ہم بہت مختصر طور پر ان روحانیین، یا دوسرے الفاظ میں صوفیائے کرام کے نظریات پیش کرتے ہیں۔ تصوف کی ساری بنیاد روح، روحانیت پر قائم ہے۔ لیکن قرآن میں ''روحانیت'' یا معرفت کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔

(1) قرآن کریم نے فرمایا: خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ (29:44) ترجمہ: اللہ نے زمین و آسمان بالحق پیدا کئے اس میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد عالی ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾ (38:27) ترجمہ: اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے بیکار نہیں بنایا۔ یہ خیال کافروں کا ہے اور کافروں کے لئے آگ سے خرابی ہے۔

قرآن کریم نے دونوں طریقوں سے موجبہ (مثبت) اور سالبہ (منفی) بہت (Forcefuly) ارشاد فرمایا کہ اللہ نے زمین و آسمان کو تخلیق فرمایا ہے (14:32، 25:59) اس کے تخلیق کرنے کی وجہ بھی ارشاد فرمائی تاکہ ہر شخص کو اس کے کاموں کی جزا مل جائے (14:51) لیکن ہمارے صوفیاء اور علماء اس دنیا کے وجود کے قائل نہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ

دنیا Exist ہی نہیں کرتی۔ ہماری فارسی اور اردو کی ساری شاعری ان اشعار سے بھری پڑی ہے۔ اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب تو اس عقیدہ کے مبلغ ہیں۔ انہوں نے کہا ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

تصوف کی اصطلاح میں اس کو وحدت الوجود کہتے ہیں۔ یعنی خدا ہر شے ہے اور ہر شے خدا ہے۔ جب یہ حضرات کائنات کے وجود کے ہی قائل نہیں، تو تسخیر کائنات کس طرح کر سکتے ہیں اور کائنات کو مسخر کرنے سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں یہ قوم ان تمام فوائد سے محروم رہتی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان سائنس کے میدان میں پیچھے ہیں۔

(2) قرآن کریم علم حاصل کرنے کے لئے حواس کا استعمال لازم قرار دیتا ہے (17:36)۔ علم حاصل ہی حواس کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ حضرات علم بالحواس کے منکر ہیں، نہ صرف اس کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس کو condemn کرتے ہیں۔ یہ صرف اس علم کے قائل ہیں جو باطنی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔

(3) یہ صوفیاء دنیا کی ہر چیز سے ''پرہیز'' کرتے ہیں اور دنیا کے متعلق ان کا Negative attitude ہوتا ہے۔

(4) قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی ذات اس درجہ بلند و اعلیٰ ہے کہ نہ اس کی اطاعت براہ راست ہو سکتی ہے (4:80) اور نہ اس سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے (42:52) ان حضرات، یعنی ہمارے علماء اور صوفیاء نے، ان دونوں قرآنی عقیدوں کو رد کیا۔ اطاعت کی جگہ پرستش کو اختیار کیا جس میں یہ بزعم خود، اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق قائم کرتے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے ذرائع، الہام، القاء، کشف، رویائے صادقہ ایجاد کئے، جن کا قرآن سے دور دور کوئی تعلق نہیں ہے۔

روح انسانی کے عقیدہ کے برخلاف قرآنِ کریم ''نفس انسانی'' کا تصور دیتا ہے۔ نفس کی پرورش اور اس کی تربیت کو زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے اور خود اس کی پرورش کے طریقے بیان فرماتا ہے۔ جسم کی پرورش طبعی اصولوں کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن نفس انسانی کی تربیت کے لئے انسان وحیٔ الٰہی، اور اس پر قائم ریاست کا محتاج ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی پرورش کے اصول و قواعد بیان کئے گئے ہیں اور یہ بات بھی واضح کر دی کہ صرف قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق نفس انسانی کی تربیت ہو سکتی ہے۔ انسان کے خود وضع کردہ اصولوں کے ذریعے نفس کی پرورش نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے :اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۴۹﴾ (4:49)۔ انسانی ذات کی نشوونما صرف قوانین خداوندی پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ جو بھی اپنی ذات کی نشوونما کرنا چاہتا ہے وہ قرآنِ کریم کے قوانین پر عمل کرے، اس کی کوشش میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ نفس انسانی کی نشوونما کے قرآنِ کریم نے دو طریقے بیان فرمائے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ مستقل اقدار پر عمل کیا جائے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کیا جائے۔ ان دونوں طریقوں پر صرف اسلامی نظام میں ہی عمل کیا جا سکتا ہے۔ غیر اسلامی نظام میں مستقل اقدار کا اجراء نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ریاست مدینہ کا قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم نے جو مستقل اقدار دی ہیں اسلامی ریاست کا ہر شہری ان اقدار پر اس لئے عمل کرتا ہے تاکہ اس کا نفس

مضبوط اور نشوونما یافتہ ہوجائے۔ اور مرنے کے بعد بھی زندہ رہے اور عالی مراتب حاصل کرتا جائے۔ لیکن ان مستقل اقدار کا معاشرہ پر بھی بہت تعمیری اثر پڑتا ہے اور ہر مستقل قدر معاشرہ کو بہتر سے بہتر بناتی چلی جاتی ہے۔ سیکولر ریاستوں کے سامنے کوئی مستقل اقدار نہیں ہوتے، اور نہ ہی سیکولر نظام کی کوئی اساس ہوتی ہے۔ ان ریاستوں کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے اور لوٹ مار، نوع انسانی کا خون چوسنا، اور Expediency پر دارومدار ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کی اساس نفس انسانی پر ہوتی ہے اور اس کے قائم کرنے کا مقصد نفس انسانی کی پرورش ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست میں کوئی شخص اس لئے جرم نہیں کرتا کہ جرم کرنے سے اس کا نفس کمزور ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلامی ریاست میں بہت کم جرائم ہوتے ہیں۔ سیکولر ریاستوں میں جرائم کے انسداد کا کوئی طریقہ نہیں ہوتا۔ ہم تعارف کے لئے چند اقدار بیان کرتے ہیں۔

(1) سب سے پہلی قدر جس پر عمل کرنے سے انسانی ذات پختہ ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے معاشرہ بھی بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے وہ احترام آدمیت ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) ترجمہ: یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے احترام آدمیت ایک مستقل قدر ہے جسے کسی مفاد یا مقصد کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا۔

(2) دوسری قدر عدل ہے۔ عدل سے مراد تمام انسانوں کو پیدائش کے عنوان سے ایک جیسا جاننا اور ہر ایک کو اپنی اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے برابر کے مواقع فراہم کرنا۔ عدل کے بارے میں جو بات قرآنِ کریم نے کہی ہے وہ آپ کو کسی دوسری جگہ نہیں ملے گی ارشادِ عالی ہے :وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (5:8)، کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو، ہر حال میں عدل کرو، کیونکہ عدل تقویٰ کے قریب ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ ہر شخص عدل پر اس لئے عمل کرے گا کہ اس کے نفس کی نشوونما ہو۔ لیکن آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس سے ریاست میں عدل کس طرح ایک معمول بن جائے گا۔ مستقل اقدار صرف وحی الٰہی ہی دے سکتی ہے۔ عقل انسانی مستقل اقدار وضع نہیں کرسکتی۔ صرف اسلامی نظام وہ نظام ہے جو جسم اور جان دونوں کی بیک وقت پرورش کرتا ہے۔

(3) ایک مستقل قدر یہ ہے کہ امور مملکت صرف ان لوگوں کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہیں۔ اسلامی ریاست میں تمام عہدیداران، جن کو اختیارات دیئے جاتے ہیں، وہ سب اختیارات ملت کی امانت ہوتے ہیں اور ان کے سپرد کرنے چاہئیں جو اس کے اہل اور نہایت درجہ کے دیانتدار ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (4:58) اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم امانات ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کی رُو سے کرو۔

(4) زائد از ضرورت مال نوعِ انسانی کی فلاح کے لئے کھلا رکھو۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے دوسروں کی فلاح کے لئے کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو بھی ضرورت سے زیادہ ہو۔ اسلامی مملکت ہر شخص کی ہر ضرورت خود پوری کرتی ہے تو پھر دولت جمع کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس مستقل قدر پر عمل کرنے سے جہاں نفس کی پرورش ہوتی ہے۔ وہاں معاشرہ کے بہترین ہونے کا تصور آپ خود کرسکتے ہیں۔ اسلامی نظام میں دوسروں کی پرورش کرنے سے اپنی پرورش ہوتی ہے۔

(5) نوعِ انسانی ایک امتِ واحدہ ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط (10:19) پوری نوعِ انسانی ایک اُمتِ واحدہ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلافات شروع کئے۔

اسلامی نظام اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ اس نظام میں ''جسم اور جان'' دونوں کی بیک وقت ربوبیت ہوتی ہے۔ ''جان'' یا ''نفس انسانی'' کی نشوونما کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر کوئی مسلمان ''نفس انسانی'' کی پرورش کرنا ایمان کا حصہ نہیں سمجھتا تو وہ ہماری طرح کا پیدائشی یا مودودی صاحب کے بقول مردم شماری کے رجسٹر کا مسلمان تو ہے، لیکن وہ قرآنی مسلمان نہیں ہے۔ چونکہ مستقل اقدار کا اجراء اور ان کا نفاذ سیکولر حکومتوں، یا چین جیسے نظام میں نہیں ہوسکتا۔ اس لئے قرآنی مسلمان اسلامی نظام قائم کرنے پر مجبور ہے۔ وہ ہر غیر اسلامی نظام سے تنفر اور کراہت کرے گا۔ البتہ جو حضرات سیکولر مزاج کے ہیں، یا جو ہمارے علماء کے زیر اثر ہو کر نفس کی بجائے روح انسانی کے قائل ہیں۔ ان لوگوں کو اسلامی نظام قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے علماء چونکہ نفس کی بجائے روح کے قائل ہیں، اس لئے انہیں اقامتِ دین کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی، اور مصر کی اخوان المسلمون یہ تینوں جماعتیں ''نفس انسانی'' کے تصور سے خالی ہیں۔ اور روح انسانی روحانیت، اور معرفتِ خداوندی کی قائل ہیں، ان تمام چیزوں کے لئے وہ پرستش کو اس کا ذریعہ بنائے ہیں۔ اقامت دین اور روحانیت پر عقیدہ رکھنا آپس میں تضاد ہے۔

انسانی زندگی کی ایک سطح وہ ہے جو حیوانی سطح پر ہے۔ یہ زندگی صرف جسم کی زندگی ہے۔ اس سطح پر جسم کے علاوہ اور کسی چیز پر یقین نہیں رکھا جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ جسم بوسیدہ ہوجاتا ہے یہاں تک کہ یہ جسم ختم ہوجاتا ہے اور انسان کی جسمانی موت واقع ہوجاتی ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ انسانی زندگی صرف حیوانی (طبعی) زندگی نہیں ہے۔ اس زندگی کے اندر ایک اور چیز بھی ہے اور وہ اس کا ''نفس'' ہے قرآنِ کریم کے ہاں اس کا نام نفخ روح ہے (32:9) قرآن اس کو نفس کہتا ہے۔ انسان کا جسم تو ہر آن بدلتا رہتا ہے اور سات سال کے اندر اس کا پورا جسم بدل جاتا ہے۔ لیکن یہ نفس نہیں بدلتا۔ اس کی نشوونما کرنا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اگر اس کی نشوونما کرلی جائے تو یہ جسم کی طبعی موت کے ساتھ بھی نہیں مرتا، اور حیات جاوید حاصل کرلیتا ہے۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بو الحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

مرنے کے بعد نفس انسانی اعلیٰ مراتب حاصل کرتا جاتا ہے۔

انسانی ذات کی بنیادی صفات وہی نہیں جو صفات ذاتِ خداوندی کی ہیں۔ نفخ روح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ساری صفات کا انسان میں Potential مستقل ہوجاتا ہے۔ اب انسان کا فرض ہے کہ وہ اس Potential کو بیدار کرے اور اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو زیادہ سے زیادہ پیدا کرے۔ جس قدر انسان صفات خداوندی کو اپنے اندر پیدا کرے گا، اسی قدر اس کا نفس مضبوط ہوتا جائے گا اور اسی قدر اس کو قربِ خداوندی حاصل ہوگا اسلامی ریاست کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ ہر اسلامی ریاست کو رازق، عادل، سمیع، علیم، حکیم اور عزیز ہونا چاہئے۔ غیر اسلامی ریاست میں، انسان، ان صفات کو

اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتا۔ صفات خداوندی کا موضوع بہت دلچسپ، مشکل اور طویل ہے ہم نے صرف بقدر ضرورت اتنا لکھا ہے۔ یہ صفات تقاضہ کرتی ہیں کہ ان پر عمل کیا جاتا بلکہ یہ کائنات اسی وجہ سے خلق کی گئی ہے کہ صفات خداوندی پر عمل کیا جائے۔ یہ ان کی صفات کا تقاضہ ہے اور یہ عمل صرف اسلامی ریاست میں ہوسکتا ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنا، صفاتِ خداوندی کا بھی ایک اہم تقاضہ ہے۔

ہم نے شروع مضمون میں وعدہ کیا تھا کہ ہم اسلامی ریاست کی Definition تحریر کریں گے۔ اسلامی ریاست وہ ہوتی ہے جس میں مستقل اقدار کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس میں ہر جگہ صفاتِ خداوندی کی چمک دکھائی دیتی ہے (39:69) اس کے ذریعے اللہ کے وعدہ پورے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوتا ہے (4:141، 3:139، 58:21) اس کے ذریعے دعائیں پوری ہوتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہاری اللہ سے دعائیں کرنا، میرے خلاف ایک شکایت ہوتی ہے۔ میں یہاں تمہاری دعائیں پوری کرنے کے لئے بیٹھا ہوں۔ اس ریاست کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ اس ریاست میں پرستش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس میں پرستش کرنے کے لئے الگ عمارتوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس ریاست میں اس کی عدالتیں، تحصیلیں، تھانے، پارلیمنٹ سب مساجد اللہ ہوتی ہیں۔ اس ریاست کی کرنسی، یا سپورٹ اس کا جھنڈا سب شعائر اللہ ہوتے ہیں۔ قرآنی ریاست کے واجبات اور Taxes ادا کرنے عبادتِ خداوندی ہے۔ اسلامی مملکت کے ہر حکم کی اطاعت عبادت خداوندی ہے۔ اس ریاست کے کسی حکم کی نافرمانی کے برے نتیجہ سے بچنا تقویٰ ہے۔ اگر ایک شخص لاہور سے ریل کے ذریعے کراچی جاتا ہے۔ اور ٹکٹ نہیں خریدتا۔ راستہ میں ٹکٹ چیکر اس کا ٹکٹ نہ خریدنے کی وجہ سے جرمانہ کرتا ہے۔ وہ جرمانہ ادا کرتا ہے۔ اس جرمانہ سے بچنا تقویٰ ہے۔

مضمون یہاں ختم ہوگیا تھا۔ لیکن قرآنِ کریم ایک انتباہ دیتا ہے۔ اس کو تحریر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم ایک نظام حیات عنایت کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے زندگی ناقابل تقسیم ہے۔ اس کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ جب قرآن ایک نظام دیتا ہے تو اس کو مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ کہ معاشی نظام قرآن کا جاری کردیں اور سیاسی نظام روس یا امریکہ کا لے لیں۔ قرآن کہتا ہے کہ Ideology ایک ہی اختیار کرو فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ (2:208)، اے ایمان والو! تم اس نظام میں پورے کے پورے داخل ہو اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔ اس آیت سے واضح ہے کہ دین میں حصے کرنا شیطان کی پیروی کرنا ہے سورہ بقرہ میں ارشادِ عالی ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85)، کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ سے انکار کرتے ہو۔ فرمایا کہ جو لوگ ایسی روش اختیار کریں گے، تو اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت میں ذلت وخواری ہے اور اگلی دنیا میں اس سے بھی زیادہ شدید عذاب ہے اور یہ سب تمہارے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ (2:85)

یہ قرآن کا بہت واضح انتباہ ہے۔ یا آپ قرآن کا نظام جاری کریں یا روس اور امریکہ کا۔ یہ آپ کی صوابدید ہے لیکن دو نظام بیک وقت جاری نہ کریں اس کا نتیجہ ذلت وخواری ہوتا ہے۔

کرنے کا کام

اگر کسی کے دل میں فی الواقعہ پاکستان کا درد ہے اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اس کے سینے میں موجزن ہے تو اس کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ مملکت کو قرآنی اقدار کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو جائے گی بلکہ عزت و ثروت کے اس مقامِ بلند پر پہنچ جائے گی، جہاں سے انسان اپنے مقدر کے ستارے جھک کر دیکھا کرتا ہے۔

یاد رکھئے!

اس قوم کو نہ سیاسی مہرہ بازیاں بچا سکتی ہیں نہ آئینی فسوں سازیاں، نہ معاشی شعبدہ کاریاں اسے سنبھالا دے سکتی ہیں نہ انتخابی ابلہ فریبیاں اسے بچا سکتی ہیں، اسے بچا سکتی ہیں صرف مستقل اقدار خداوندی کی جنت سامانیاں۔ اگر ان سے اعراض برتا گیا تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ یہی خدا کی سنتِ مستمرہ ہے

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیلاً۔

اور سنت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔

یاد رکھیئے!

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر25)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

منطقی اصول اور اس کے استقرائی اور استخراجی طریقہ کار کا تعارف:

منطق کے ارسطو کے معروف تین قوانین فکر بنیادی سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ صادق نہ ہوں، تو کوئی بھی دیگر یا صادق قضیہ یا بیان اور اس کا تصور ممکن نہ ہو۔

1۔ اصول عینیّت: الف، الف ہے۔

2۔ اصول غیر متناقص: کوئی چیز بھی بیک وقت الف اور غیر الف نہیں ہو سکتی۔

3۔ اصول امتناع اوسط: ہر شے یا الف ہے یا غیر الف۔

ان اصولوں کو ثابت کرنے کے لیے حکمائے منطق وضاحت کرتے ہیں کہ ثبوت کا امکان اسی وقت ہے جب تک ثبوت کے اصول مہیا ہوں اور جو خود محتاج ثبوت نہیں ہوتے۔ ان اصولوں کے نفاذ سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں، ان سے ایک حد تک جواز تو پیش کیا جا سکتا ہے کہ انھیں منطقی اصولوں کی روشنی میں دیگر قضایا سے مستخرج کیا جا سکے۔

تجربیت پسند توجہ دلاتے ہیں کہ قضایا صادق یا کاذب ہونے کے علاوہ غیر یقینی بھی کہلائے جا سکتے ہیں۔ منطق میں البتہ غیر یقینی کا لفظ ہمارے علم کی مناسبت سے استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ حقیقت میں کوئی وقوعہ غیر یقینی ہوتا ہے۔ عقلیت کے مطابق کوئی بھی روایت، خواہ وہ الفاظ کے معنی کے متعلق ہو یا منطق سے، اس وقت تک کارآمد اور قابلِ قبول نہیں ہوتی جب تک وہ حقیقت کے عین مطابق نہ ہو۔

نظریہ عقلیت مسلمات کو منطق کی رو سے ثابت کرتا ہے۔ یہ منطق کے دونوں اصولوں سے کام لیتا ہے یعنی ایک استقرائی جس میں جزئیات سے کلیات اخذ کی جاتی ہیں، جبکہ دوسرا استخراجی، جسمیں کلیات سے جزئیات مرتب کی جاتی ہیں۔

استقرائی گروہ، جس میں جزیات سے کلیات اخذ کی جاتی ہیں۔ کا ہم پہلے جائزہ لیں گے۔

استقرائی علم:

اس کی توجیہہ فلسفہ میں یوں بیان کی جاتی ہے۔

(1) تجربی تعمیم: اجزاء کے علم کی بنیاد پر، کُل پر حکم لگانا۔

(2) ایک جماعت کے چند ارکان کے بارے میں بیان کی بنیاد پر کُل جماعت کے بارے میں نتیجہ اخذ کرنا۔

یہ تصدیقات ظنی ہوتی ہیں اور چند سے کل پر جانے کی استقراء کی جست یا زقندان میں پائی جاتی ہے۔ سائنسی استقراء کی بنیاد چند امثلہ کے مشاہدہ پر ہے۔ ان میں مشترک صفات اور ان کے مابین علّی ربط ہوتا ہے۔ یہ علّی رشتوں کی بنیاد پر تعمیمات قائم کرنے کا طریقہ فراہم کرتا ہے۔

استقراء کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ ہم مشاہدہ سے آغاز کریں۔ جب کافی تعداد میں مشاہدات جمع ہو جائیں تو ان کی بنیاد پر ایک مفروضہ وضع کریں۔ پھر مفروضہ کی آزمائش کریں۔ اگر تجربہ مفروضہ کی تائید اور تصدیق کرے اور تکذیب نہ پائی جائے تو اس کو ہم قانون کا درجہ دے سکتے ہیں۔ استقرائی نتیجہ کے متعلق یہ واضح ہے کہ وہ مقدمات میں پیش کیے گئے شواہد سے زیادہ جامع ہوتا ہے۔

ڈیوڈ ہیوم نے اس اصول پر تنقید کرتے ہوئے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ یہ منطقی اعتبار سے غلط ہے۔ منطقی استدلال کے صحیح ہونے کی لازمی شرط یہ ہے کہ

1۔ اس میں نتیجہ مقدمات سے کمزور ہوتا ہے۔ درست منطقی استدلال کا نتیجہ کسی ایسی بات پر مشتمل نہیں ہو سکتا جو قبل ازیں مقدمات میں مذکور نہ ہو۔

2۔ حسی مدرکات کا تعلق انفرادی واقعات سے ہوتا ہے اور انفرادی واقعات میں عالمگیر قانون اخذ کرنے کا کوئی منطقی طریقہ موجود نہیں۔ اس لیے استقراء منطقی اعتبار سے غلط لیکن ہیوم اسے نفسیاتی اعتبار سے ناگزیر سمجھتا ہے۔

استقراء کی تعریف سے ہم اس اصول کا مطالعہ کرتے ہیں کہ کائنات نظم وضبط کی پابند ہے۔ ہم بہت سے ایسے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہوتے ہیں اور ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور مستقبل میں بھی جو ماضی کی مانند ہے ایسا ہی ہوتا رہے گا ہم دیکھتے ہیں کہ سورج ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے، آگ ہمیشہ جلاتی ہے۔ یہ ماضی کے مشاہدات ہیں اور انہی پر انحصار کرتے ہوئے مستقبل کے لیے یہی قوانین وضع کیے جا سکتے ہیں۔

استخراجی منطق: اس طریق استدلال کو کہتے ہیں، جن میں پہلے چند مقدمات کو بطور اصول موضوعہ (Postulates) تسلیم کر لیں اور پھر ان میں سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو بیان کریں۔

ارسطو کے مطابق امور معلومہ (Data) سے نتائج اخذ کرنے کے بعد یہ اصول ہمیں بطور مسلمات ماننے ہوں گے۔ اسی کو بنیادی مسلمات یعنی بغیر کسی ثبوت کے (A priore) کہتے ہیں۔

اس لیے استخراج کی تعریف فلسفہ میں یوں بیان کی جاتی ہے۔

منطق میں اخذ نتائج کا وہ عمل یا طریقہ جس میں دیے ہوئے صادق مقدمات سے منطقی طور پر صادق نتائج حاصل ہوں۔

اس اصول پر فرانس بیکن نے تنقید کرتے ہوئے اس بنا پر رد کر دیا کہ وہ نئے حقائق کے انکشاف اور اکتشاف میں ممد و معاون نہیں ہوتی۔

یہی مصنف مزید لکھتا ہے کہ:

منطق کا استخراجی اصول، حقیقت کی تلاش کے بجائے بے ہنگم تصورات پر مبنی غلطیوں کو ثابت کرنے کے لیے اور ان کو پختہ کرنے پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہے۔

منطقیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ریاضیاتی دلائل استخراجی ہوتے ہیں۔

ریاضیاتی منطق:

اس گروہ میں بعض کا خیال ہے کہ استخراجی مسلّمات ریاضی کی دنیا سے متعلق ہیں جنہیں انسانی نفس نے بغیر دلیل، صحیح تسلیم کر رکھا ہے اور چونکہ تمام کائنات ان اصولوں پر پوری اترتی چلی جا رہی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس انسانی اور کائنات کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یہاں ایسی صداقتوں کی تلاش ہے جو لازمی ہوں مگر حضوری نہیں۔ ایسی صداقتیں جن میں دونوں مختلف قضایا مضمر ہوں۔ ایک لازمی و تجزیاتی اور دوسرا ترکیبی و غیر لازم۔ علم الحساب کی ایک سادہ مثال ۔ 4=2+2 سے یقین ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ صادق اور اس کا صادق ہونا لازمی ہے۔ یا پھر علم الہندسہ کی سادہ مثال ایک مثلث کے تین زاویے 180 کے برابر ہوتے ہیں۔ چونکہ مثلث کی تعریف میں اس کے زاویوں کا ہونا شامل ہیں۔ اس لیے اس بیان کو بیک وقت لازمی اور ترکیبی (حضوری نہیں) گردانا جائے گا۔ استخراجی نظام کا حصہ ہونے کی وجہ سے یہ حضوری بھی کہلائے گا۔

ریاضیاتی علوم کی تصدیق حقائق سے نہیں ہوگی۔ ان میں دو اساسی اصول تکرار اور تضاد ہیں۔ اس کے قضایا اور کلیے کائنات کے بارے میں کچھ اطلاع نہیں دیتے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مضمرات (Implication) کی بدولت ملحق ہیں۔ چنانچہ ان کی تصدیق نظام (System) کی رو سے ہوگی یعنی ان اولیات (Axioms) سے جو اس نظام کے اساسی اصول ہیں۔

اِسی کی وضاحت محترم بُرہان الدین احمد نے تجربیت (اختباریت) اور عقلیت کے بطور ادراکِ کے یوں کی ہے۔

تجربیت اور عقلیت بطور ادراک علم:

فلاسفرز نے تجربیت کو جزوی طور اور عقل کو کُلی طور پر درج ذیل انداز سے سمجھا ہے۔

1۔ حواس سے مدرکات جزوی کا ادراک ہو اور عقل کلیات کا ادراک کرتی ہو۔

2۔ جزوی محسوس ہو، کلی معقول ہو۔

3۔ جزوی مرکب ہو اور کلی بسیط ہو۔

4۔ جزوی کا وجود، وجود خارجی ہو اور کلی ذہنی ہو۔

5۔ محسوس زمانی ومکانی ہو اور معقول ورائے زمان ومکان ہو۔

6۔ محسوس ممکن ہو اور معقول واجب ہو۔

7۔ محسوس حادث ہو اور معقول قدیم ہو

ایسے اندازِ سے البتہ بات واضح نہیں ہوتی کہ محسوسات کو معقولات کے تحت منظم کیسے کیا جا سکے گا۔ اس لیے ماننا لازم آئے گا کہ عقل درحقیقت ''ارادہ تعقل'' ہی ہے۔ لہٰذا

1۔ اگر ادراک حسی سے حاصل شدہ علم کے خام مواد کو منظم نہ کیا جائے تو علم میں کلیّت اور وجوب اور لہٰذا یقین پیدا نہ ہوگا۔

2۔ اگر علم کا خام مواد اور مدرکات حسی سے حاصل نہ ہو تو اس کی ضمانت نہ ہوگی کہ علمی قضیوں کے بالمقابل حقیقت ویسی ہی ہے یا نہیں جیسی قضیوں میں بیان ہوئی ہے۔

3۔ اس لیے ارادہ ادراک اور ارادہ تعقل مل کر ذریعہ علم ہیں اور اس طرح ارادہ تعقل کی کارفرمائی محسوسات تک محدود رہتی ہے اور صرف ارادہ تعقل میں علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

4۔ اس انداز فکر سے سمجھا جائے کہ عقلیت ایک پہلو سے وہ نظریہ علم ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ مشاہدہ نہیں بلکہ عقلی غور وفکر ہے۔ اس لحاظ سے عقلیت گویا اختباریت کی ضد ہے۔

اِرتقائے انسانی میں علم کی صلاحیت ودیعت کرنے کی وضاحت:

یہاں ہمیں ملحوظِ نگاہ رکھنا ہوگا کہ علم کے معنی دریافت کرنے کے دو طریقے ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ فلاں شے کیا ہے؟

اور دوسری بات یہ کہ یہ شے کس قانون کے تابع کام کر رہی ہے؟

جوں جوں انسان اشیاء کے قانون کو دریافت کرتا چلا جائے گا، ہر مادی قوّت اس کے سامنے مسخر ہوتی چلی جائے گی، یہ انسان کے سامنے جھکتی چلی جائیں گیں۔ یہ مقام آدم ہے کہ تسخیر کائنات کے ذریعے سامان نشوونما حاصل کرے۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ کسی کو، کس قدر مقام آدمیت حاصل ہوا ہے، دیکھنا یہ چاہیے کہ اسے فطرت کے قوانین کا علم کس قدر حاصل ہوا ہے؟ جس قدر علم الاسماء والی بات کسی میں نمود ہوئی ہے، اسی قدر وہ مقام آدمیت پر ہے۔ ہر آدم مومن نہیں ہوتا، لیکن ہر مومن آدم ہوتا ہے، بلکہ وہ پہلے آدم ہوتا ہے، اس کے بعد مومن بنتا ہے۔ مقامِ آدم تو یہ ہے کہ علم کی استعداد کو کام میں لاتے ہوئے تسخیر کائنات کرے اور مقام مومن یہ ہے کہ تسخیر کائنات کے ماحصل کو اللہ کی مستقل اور مُطلق اقدار کے حصولِ علم کے بعد قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرے۔ یاد رہے کہ جو قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتا وہ مومن تو ایک طرف آدم بھی

نہیں ہوسکتا۔ جسے مقام آدم نصیب نہیں وہ مقام مومن تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا ہمارے سامنے تین گروہ آ گئے۔ پہلا گروہ، وہ ہے جو علم کی بدولت تسخیر کائنات کرتا ہے۔ یہ مقام آدمیت پر فائز ہے۔

دوسرا گروہ، وہ ہے جو علم سے کام نہ لینے کی بنا پر تسخیر کائنات ہی نہیں کرتا۔ یہ مقام آدم پر ہی نہ ہونے کی وجہ سے مقام مومن تک نہیں پہنچ سکتا۔

تیسرا گروہ، وہ ہے جو علم کی بدولت تسخیر کائنات کر کے سامان نشوونما حاصل کرتا ہے اور پھر اس کو وحی کے علم کی روشنی میں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف میں لاتا ہے۔ یہ گروہ مقام آدمیت پر بھی ہے اور مقامِ مومن پر بھی ہے۔ یہ جماعت مومنین کا گروہ ہے، جس کا آج دنیا میں نظری طور پر کبھی کبھار نام یاد کرنے پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔

مغربی مفکرین نے درجِ بالا تین گروہوں میں سے دوسرے گروہ کو عقل کے ذریعے بروئے کار لائے ہوئے تخلیقی اعمال کی بنا پر حیوان سے جدا انسانی مخلوق کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ یہاں البتہ اِس گروہ کی عقلی صلاحیتوں کے بیانیہ میں وحی کی روشنی میں کام نہ لینے والی عقل کے دائرہ کار کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لہٰذا اِس کا مُختصر طور پر جائزہ لینا ہوگا۔

عقل محض کا دائرہ

اس ضمن میں برگسان کہتا ہے کہ عقل تنہا مادی اشیاء کا مکمل علم تو فراہم کر دیتی ہے لیکن انسانی اقدار کے معاشرتی زندگی گزارنے کا علم دینے میں ناکام رہتی ہے۔

''انسان تنہا عقل کی روشنی میں صحیح راہ پر چل ہی نہیں سکتا۔ عقل اسے کسی دوسرے راستہ پر ڈال دے گی۔ عقل ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہتے ہیں تو وہ اس بلند سطح کے متعلق ممکنات کا سراغ دے سکے تو شاید ورنہ وہ حقیقت کا پتہ تو کسی صورت میں دے ہی نہیں سکتی۔''

اس لیے کہ عقل کا طریقہ تجرباتی ہوتا ہے۔ عقلی طریق یہ ہے کہ انسان ایک چیز کو اختیار کرتا ہے۔ اس پر مدتوں محنت کرتا ہے اور آخرالامر دیکھتا ہے کہ اس کا تجربہ ناکام رہا۔ وہ اسے چھوڑ دیتا ہے اور کوئی دوسری راہ اختیار کرتا ہے اور ایک مدت تک اس راہ پر چلتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ناکام تجربوں کے بعد وہ آخرالامر صحیح راستہ پر جا پہنچتا ہے اور جب وہ اس راستہ پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہ وہی راہ تھی جس کی طرف خدا نے وحی کے ذریعہ سے رہنمائی کی تھی۔ افلاطون کے الفاظ میں:

یہ (ارباب فکر) کچھ بنائیں گے۔ اسے پھر مٹائیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان، خدا کی راستوں سے ہم آہنگ کر لیں۔

اس کی وضاحت میں آئن سٹائن لکھتا ہے کہ:

سائنس (علم استدلالی) صرف یہ بتا سکتی ہے کہ ''کیا ہے'' وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ ''کیا ہونا چاہیے'' اس لیے اقدار متعین کرنا اس کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فکر و عمل کے لیے معیار مقرر کرے..... سائنس نہ تو

اقدار متعین کرسکتی ہے اور نہ ہی انھیں انسانی سینے کے اندر داخل کرسکتی ہے۔ سائنس زیادہ سے زیادہ ایسے ذرائع فراہم کرسکتی ہے جن سے انسان مقصد حاصل کرے۔ اقدار اور اس کے مقاصد کے علم کے حصول میں؛ مجھے اپنی محدودیت کا ادراک اور اپنی کم علمی کا بھی پتہ ہے۔

عقل کا فریضہ ہی یہ ہے کہ جس کی عقل ہے، وہ صرف اسی کے مفاد کے متعلق فکر کرے۔ عقل کے اس فریضہ کو ''تحفظ خویش'' یا Self Preservation کہتے ہیں۔

قرآن کے مطابق انسانی جذبات کے دو حصّے ہیں؛ ایک وہ جذبات، جن کو انسان خدا کی طرف سے دیئے گئے علم (وحی) کے بغیر بروئے کار لائے۔ ایسے جذبات کی پیروی کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایسے جذبات کو انگریزی میں Irrational Passions کہتے ہیں، اور ان ہی کو ''بے باک جذبات'' بھی کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جذبات ہیں، جن کو انسان، خدا کی طرف سے دیئے گئے علم یعنی وحی کی روشنی میں بروئے کار لائے۔ ایسے جذبات کی پیروی کا نتیجہ خوشگواری، سربلندی ہوتا ہے، مرتبے بلند ہوتے ہیں۔ ایسے جذبات کو انگریزی میں Rational Passions کہتے ہیں۔ Irrational وہ عقل ہے جو خود اپنا ہی تحفظ اور بھلا چاہتی ہے۔ اقبال نے Rational عقل کا نام ''عقل جہاں بیں'' رکھا ہے اور Irrational عقل کا نام ''عقل خود بیں'' رکھا ہے۔ عقل بغیر وحی کی روشنی کے، اپنے فریضہ ''تحفظ خویش'' سے آگے جا ہی نہیں سکتی،

حاصلِ مبحث

اب تک کے مطالعہ سے حُکمائے مغرب کے نظریہِ علم کا حاصل مبحث یہ ہے کہ

ایک گروہ کا خیال ہے کہ اشیاء خارج میں موجود ہیں اور ہر شے میں اس کی اپنی خاصیت ہے۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ خارج میں نہ کوئی شے موجود ہے اور نہ ہی ان اشیاء کے خواص موجود ہیں۔ ان اشیاء کا وجود بھی ہمارے دِل یعنی مائینڈ کا پیدا کردہ ہے اور ان کو خواص بھی اس سے عطاء ہوتے ہیں۔

جہاں تک ذرائع علم کا تعلق ہے تو ایک گروہ کا خیال ہے کہ ہمارے مشاہدات اور تجربات ہی علم کا واحد ذریعہ ہیں دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ علم کا ذریعہ استدلالی ہے، جس سے مفہوم ہے کہ ہمیں بعض اصولوں کو بطور مسلمات تسلیم کرنا ہوگا پھر ان مسلمات کی روشنی میں حواس کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات سے نتائج اخذ کرنے ہوتے ہیں۔ جب تک ان مسلمات کو بطور معتقدات نہ مانا جائے سائنس کا علم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

دوسرے گروہ میں ایک گروہ ان مسلمات کو منطق سے ثابت کرتا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ مسلمات ریاضی کی دنیا سے متعلق ہیں۔ انہیں انسانی نفس نے بغیر دلیل صحیح تسلیم کر رکھا ہے۔ تمام کائنات ان اصولوں پر پورا اُترتی جارہی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی اور کائنات کا سرچشمہ ایک ہے۔ یہ سب مشہود کائنات کے متعلق ہے اور باقی رہی غائب کی دنیا تو پہلے غیب کی دنیا کے متعلق سائنس کے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں

اور دوسرے مشہود دنیا کے متعلق بھی جب تک ایسے مسلمات بطور اصول تسلیم نہ کر لئے جائیں جو تجربہ اور مشاہدہ کی پیداوار نہیں، یقینی معلومات حاصل ہی نہیں کی جاسکتیں۔

عقلِ محض کے خارجی کائناتی علوم کی آگاہی کے برعکس اب ہم یہاں علمِ غیر استدلالی کے ذریعہ انسان کی ذات سے متعلقہ مستقل اور مُطلق معیار کے علوم کا جائزہ لیں گے۔

علمِ استدلالی کی بحث کے بعد ہم جانتے ہیں کہ اخلاقیات میں علمِ غیر استدلالی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے اندر کوئی چیز ہے، جو یہ بتا دیتی ہے کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں برا۔ اس چیز کا نام اخلاقیات کی اصطلاح میں اخلاقی شعور (Moral sense) ہے۔ اسے داخلی وجدانیت بھی کہا جاتا ہے۔

علم غیرِ استدلالی (داخلی):

ان میں درج ذیل ذرائعِ علوم سے بحث ملتی ہے۔

1۔ ضمیر 2۔ باطنیت یا تصوف 3۔ وجدان یا نفس غیر شعوری

ضمیر بطورِ علم:

فلسفہ میں ضمیر بطورِ علم سے مراد حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کا ملکہ۔ ایسا شدید تاثری کیفیت کا حامل تجربہ جس میں عمل کرنے کے رجحان کو سماجی طور پر مشروط خیال سے دبا دیا جاتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بُرے عواقب برداشت کرنے پڑیں گے۔ ضمیر بطور حق کی پہچان میں درج ذیل دلائل سامنے لائے جاتے ہیں۔

1۔ ضمیر ایک وجدانی اور جبلی صفت ہے۔ اس کے فیصلے حق اور بیرونی اثرات سے پاک ہوتے ہیں۔

2۔ ضمیر ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ یہ ہر انسان میں موجود ہے۔ بظاہر انسانوں میں مختلف اخلاقی نظام ہیں۔ وقت اور زمانے کے ساتھ یہ بدلتے ہیں لیکن ضمیر ایک ایسی شے ہے جو ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس کا تعلیم و تربیت سے بھی کوئی تعلق نہیں۔

3۔ ضمیر کی ملامت یا سرزنش ایک عالمگیر اصول ہے۔ بڑے سے بڑا ظالم اور بدکار بھی اس کی ملامت سے نہیں بچ سکتا۔ ایک وقت آتا ہے کہ جب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ توبہ کرتا ہے۔

4۔ ضمیر ایک محتسب (Censor) کا کام کرتا ہے۔ ہماری ناآسودہ بُری خواہشات کو وہ شعور میں آنے سے روکتا ہے۔

5۔ ہماری شعوری زندگی میں اس کی گرفت ہوتی ہے لیکن ہم اپنے مفادات کے تحت اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہماری یہ لاشعوری خواہشات خواب کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔

6۔ ہماری تمام اخلاقی بیماریاں ضمیر کی آواز دبا دینے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

اس لیے اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ جب تمہارے سامنے کوئی بات آئے تو اپنے دل سے پوچھے کہ ایسا کرنا اچھا ہے یا برا۔ جو وہاں کا فیصلہ ہوگا۔ اس کے مطابق یہ کام اچھا یا برا بن جائے گا۔ اگر ضمیر نے اسے قبول کر لیا تو اچھا ہوگا اور اگر نہ کیا تو وہ بُرا ہوگا۔

ضمیر بطور علم کا تنقیدی جائزہ:

اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر بچہ پوچھ لے کہ چوری کرنا کیوں بُرا ہے تو اس وقت آپ لامحالہ ان نتائج قبیحہ کا ذکر کریں گے جو چوری کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور افادی نظریہ پر آجائیں گے۔ لہٰذا یہ نظریہ غلط ہے کہ حق پر مبنی اعمال کی دلیل دل کا فیصلہ ہے۔ جسے ہم ضمیر کا فیصلہ کہتے ہیں۔ چوری اپنی ذات میں شر ہے۔ ضمیر، وراثت اور ماحول وغیرہ کے خارجی اثرات سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ یہ حق و باطل کی تمیز کا ذریعہ قرار نہیں پاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ضمیر کی آواز کبھی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔

ضمیر از خود کوئی داخلی اوزار نہیں۔ یہ سوسائٹی اندرونی طور طریقوں کا نام ہے اور یہ عالمگیر نوعیت کا نہیں۔ یہ اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں کرتا۔ یہاں مجھے خنزیر کا گوشت کھانے کا تصور ہی الٹیاں کروانا شروع کر دیتا ہے اور وہاں ایک آدمی اس کو مزا لے لے کے کھاتا ہے۔ یہاں میں گا۔ کا گوشت مزے سے کھاتا ہوں جبکہ ہندو کے ہاں اس کا ضمیر گا۔ کو خدا مانتا ہے۔ سوسائٹی نے جو کچھ انٹرنلائز کر رکھا ہے ہمارا ضمیر اسی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے، جاننے کا معیار اندر نہیں بلکہ باہر معاشرہ میں ہوتا ہے۔

سقراط کے ضمیر کے نظریہ سے ہمیں اُس کی اپنی مثال سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر کوئی قوت ایسی ہے جو اسے شر سے روکتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ قوت اس امر کا فیصلہ بھی کرسکتی ہے کہ فلاں کام فی ذاتہٖ شر ہے۔ اس لیے اس سے مجتنب رہنا چاہیے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت موجود ہو تو پھر ''اخلاقیات'' کے متعلق کچھ سوچنے اور لکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ پھر تو مسئلہ یوں ہو جائے کہ:

1۔ ضمیر وہ کسوٹی ہے جو حق و باطل کو الگ الگ کر دیتی ہے۔

2۔ ہر انسان کے اندر ضمیر موجود ہوتا ہے اس لیے

3۔ ہر انسان از خود حق و باطل کا امتیاز کرسکتا ہے۔

4۔ خیر، اپنی ذات میں خیر اور شر اپنی ذات میں شر ہے۔ اس لیے خیر اور شر کی عالمگیر فہرستیں موجود ہونی چاہئیں۔

لیکن کیا واقعی یہی ہے؟ بالکل نہیں ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ مختلف اشخاص کا ضمیر خیر اور شر کے متعلق الگ الگ فیصلے دیتا ہے۔ اگر ضمیر کی آواز ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ایک ہی ہوتی تو صحیح اور غلط، خیر و شر، حق و باطل کے متعلق یہ جھگڑے ہی کیوں پیدا ہوتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ضمیر کی آواز حق و باطل کا مطلق معیار نہیں بن سکتی۔ ضمیر تو معاشرے کا آئینہ دار ہے اور اس کے خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ پس یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اس کے احکام تعصب سے خالی ہوں۔

اگر ضمیر کی آواز کو مُطلق اقدارِ حق کے لیے سند مان لیا جائے تو یہ سند صرف ایک شخص کے لیے سند بن سکتی ہے جس کی ضمیر اسے ایسا کہتی ہے۔ میری ضمیر کا فیصلہ آپ کے لئے سند قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا یہ ''اخلاقیات'' میں حق و باطل کا معیار مطلق کا

علم نہیں بن سکتی۔ اور یہ کوئی پیدائشی قوت نہیں بلکہ اکتسابی شے ہے جس کی تعلیم و تربیت سے نشوونما ہوسکتی ہے۔ یہ اپنے اپنے ماحول اور مذہبی عقائد کا پرتو ہوتی ہے اور ایسی قوت نہیں کہ ذریعہ علم بن سکے۔ اگر ''اخلاقیات'' میں مطلق اور مستقل حق کی اقدار کے علم کے لیے ضمیر سند قرار پا جائے تو انسانی کاروبار ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔

2۔ باطنیت/کشف یا تصوف بطور ذریعہِ علم

غیر استدلائی علم میں باطنیت کے موضوع پر بھی بحث شامل ہوتی ہے۔ باطنیت کے نتائج غیر استدلالی دنیا سے متعلق ہیں لیکن یہ فن اکتسابی ہے اور قوت ارادی کے پختہ اور مرتکز کرنے کا ذریعہ ہے۔ اِس غیر استدلالی علم کا منبع کا دارومدار کشف کے تصور کو سامنے لا کر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے مفہوم سے آگاہی حاصل کی جائے۔

کَشْفُ کا مفہوم ہے، پردہ اٹھا دینا۔ کسی بات کو ظاہر کر دینا (تاج)۔ قرآن کریم میں ہے۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ (50:22)

ہم نے (تیری آنکھوں سے) پردہ اٹھا دیا اور اس طرح حقائق تجھ پر منکشف ہو گئے۔

نیز اس کے معنی شدت کی سختی اور گھبراہٹ کے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں کشف والہام کا عقیدہ ہے اس کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ ختم نبوت کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی شخص خدا سے براہ راست ہمکلام ہوسکتا ہے اور براہ راست حقائق کا علم حاصل کرسکتا ہے، ختم نبوت کی مہر کو توڑ دینا ہے۔ اب انسانوں کے لیے علم کے سرچشمے صرف دو ہیں۔ قرآن کریم (جو وحی پر مشتمل ہے) اور عقل انسانی۔ تصوف کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک مذہبی عقیدہ کا ہی درجہ دے سکتے ہیں، کیونکہ تصوف خود علم و عقل اور تدبر و فکر کے دروازے بند کر کے اس میں داخل ہونے کے لئے بلا مشروط عقیدت و احترام پر ہی انحصار کرتا ہے۔

اِس کی وضاحت علامہ اقبال نے اپنے پانچویں خطبہ کے آغاز میں ہی اس انفرادی تجربہ کی تصریح مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے الفاظ میں یوں کی ہے۔

محمدؐ عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد و اللہ اگر من رفتمے ہرگز باز نیامدے

محمد ﷺ فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ میں اگر اس مقام تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا۔

اپنے انہی خطبات میں پہلے ہی خطبہ میں بالتصریح واضح کیا ہے کہ صوفیانہ مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانا (یعنی ان کا ابلاغ) ناممکن ہے تو اس لیے بھی کہ یہ مشاہدات وہ غیر واضح احساسات ہیں جن میں عقلی استدلال کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس میں ارباب کشف کے نتائج ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس لیے ضمیر کی طرح یہ علم بھی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس میں صاحب تجربہ کا نتیجہ یکسر انفرادی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ عام دنیائے انسانیت کے لیے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے اس قسم کے

احوال ومشاہدات کی تحقیق علمی نہج پر کی جائے۔ چونکہ نظریہ باطنیت یا تصوف کی توضیح ہمارے موضوع سے صرف ذریعہ علم کی تحقیق تک محدود ہے، اس لیے مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی تناظر میں یہاں نظریہ وجدان کا بھی جائزہ لیا جارہا ہے۔

وجدان کا ذریعہ:

وجدان کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں وضاحت ملتی ہے کہ:

وجدان وہ ذریعہ علم ہے جس کے ذریعے ہم بغیر کسی استنباط، مشاہدہ، عقل یا تجربے سے کوئی علم حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بالکل آزاد اور بنیادی ذریعہ علم ہے جو ہمیں کسی اور ذریعے سے حاصل نہ ہوسکتا ہو۔ ضروری سچائیاں اور اخلاقی اصول بعض اوقات وجدانیت کے ذریعے سے بیان کیے جاتے ہیں۔

وجدان جو بلا واسطہ حواس اور غیر استدلالی ذریعہ ادراک ہے، صرف باطنی کیفیات اور ایسے مدرکات حس کے ادراک کا ذریعہ ہے، جو ہوتے تو ہیں مکانی وزمانی مگر وجدانی انکشافات کے ساتھ وہ زمان کے لحاظ سے موجود اور مکان کے لحاظ سے غائب بھی ہوسکتے ہیں اور زمان ومکان کے لحاظ سے بھی غائب ہوسکتے ہیں۔ یعنی آئندہ وقوع میں آنے والے واقعات۔

وجدانی انکشافات میں بھی ادراک اسی اصول پر واقع ہوتا ہے جیسے ادراکات حسی واقع ہوتے ہیں۔ اور دونوں کی توجیہ ایک ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وجدانی انکشافات کی صحت تجربی توثیق سے پہلے اور دوسروں کی شہادت کے بغیر شائبہ ظن اور احتمال خطا سے پاک نہیں ہوتی۔ اس کا یہ بھی نقص ہے کہ وجدان ماورائی حقائق کے علم کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔

فکری دنیا ابھی تک وجدان کے متعلق یہ بھی نہیں بتاسکی کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔ لیکن ہمارے دور کا وجدان کا سب سے بڑا موید برگسان اسے (A higher knid of intellect) ایک بلند نوع فکر ہی قرار دیتا ہے۔ جو فکری ارتکاز (Concentration) یا ممارست کا غیر شعوری نتیجہ ہوتی ہے۔

وجدان کی اصطلاح سے فلسفہ میں مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ حس وتجربہ اور عقل، فہم بحیثیت ذرائع علم سبھی سے مختلف، معروض کا راست بلا واسطہ درک ہے۔ برگسان کے مطابق عالم کا معلوم کی کنہ میں نفوذ کر جانے کا راست عمل ہے۔ اخلاقیات میں وجدانیّت اس بات کا ادّعا رکھتی ہے کہ بعض اعمال کے بارے میں راست طور پر یہ ان کے افادیت یا نتائج سے قطع نظر، ان کے صواب وخطا کا علم ہوتا ہے۔ اخلاقی وجدانیّت کی دوسری صورت کے مطابق اخلاقی امور کا علم، عمومی وجدانیّت پر مبنی ہے۔

وجدان (Intuition) کی تعریف ولیم للّی نے یہ کی ہے:

ذہن کا کسی چیز کے بارے میں فوری ادراک جو بغیر کسی عقلی دلائل کے نتیجے میں حاصل ہوا ہو، وجدان کہلاتا ہے۔

اس نظریہ کے مطابق حق وصداقت یا اخلاقیات کے جاننے کا ذریعہ انسان کا وجدان ہی ہوسکتا ہے جو بلا دلیل تسلیم کرے۔ اس لیے وجدانی نظریہ بلا دلیل (A priori) ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب ہم وجدان کے بارے میں دلائل دے رہے

ہوں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ وجدانی نظریہ نہیں رہا بلکہ عقلی نظریہ ہے۔ اس طرح وجدانیت بحیثیت ایک اخلاقی نظریہ کا نام دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں یہی کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ نظریہ کہتا ہے کہ تمام وجدانی افعال ناقابل تجزیہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو حکماء مغرب وجدانیت کے دعویدار ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ وجدانی افعال معاشرے کے مفاد میں ہوتے ہیں تو درحقیقت وہ وجدانیت سے اس وقت راہنمائی نہیں لے رہے ہوتے۔

قرآن میں وجدان کی وضاحت حضرت یوسف کی تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ کی شکل میں:

قرآنِ کریم میں اِس کی طرف سورہ یوسف میں اشارہ دیا گیا ہے کہ۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (12:6)

(باپ نے مزید کہا) تیرا رب تجھے کسی عظیم مقصد کے لئے منتخب کرے گا، اور تجھے ایسی فراست عطا کرے گا کہ تیری نگاہ معاملات کے انجام ونتائج تک فوراً پہنچ جائے۔

تاویل کے معنی ہیں، کسی بات کے انجام کو سامنے رکھنا، اور احادیث کے معنی ہیں واقعات یا باتیں جو سامنے آئیں۔ روزمرہ کے واقعات ہم میں سے ہر ایک سامنے آتے ہیں، ایک شخص ان کو سرسری طور پر دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے، دوسرا دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو بڑی گہری بات ہے اور میری بصیرت بتا رہی ہے کہ یہ چیز کسی دن اس طرح سے ہوگی۔ یا ہم کہتے ہیں کہ مجھے تو اس کے عزائم یہ نظر آتے ہیں۔ یہ دوسرا شخص ذہنی طور پر کڑیاں ملاتا ہے اور کڑیاں ملانے کے بعد بات کے انجام تک پہنچتا ہے، اسے کہتے ہیں تاویل الاحادیث یعنی ''بات سے اس کے انجام تک پہنچنا''۔ کڑیاں ملا کر انجام تک پہنچ جانا۔ جسے تاویل الاحادیث کہتے ہیں، وہ کوئی غیبی یا باطنی شے نہیں ہے بلکہ یہ عقل انسانی کی یعنی وجدان ہی ایک لطیف شکل ہوتی ہے۔ یہ بصیرت کی انتہا ہوتی ہے، یہ بڑا ہی Fine Intellect ہوتا ہے۔

کبھی کبھی ہم کہتے ہیں کہ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ فلاں بات میں نے کیسے کہی لیکن کچھ ایسا میرے ذہن میں آیا اور میں نے کہہ دیا اور وہ بات واقعی ویسے ہی ہوگئی۔ انسان کسی فن کے اندر، کسی علم کے اندر اتنا جذب ہو جائے کہ ہر وقت اسی کا خیال رہے تو اس میں یہ وجدان Intuition والی چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ذہن ہی کی صلاحیت ہے۔ ایسے ذہن کی حامل شخصیت حالات وواقعات پر غور کر کے انجام تک پہنچ جایا کرتی ہے۔ انجام تک پہنچ جانے کو تاویل الاحادیث کہتے ہیں۔ عام شخص تو شعوری طور پر کڑیاں ملا کر نتیجے پر پہنچتا ہے، لیکن لطیف بصیرت کے حامل لوگ غیر شعوری طور پر کڑیاں ملا رہے ہوتے ہیں اور نفسِ شعور یہ کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کڑیاں کس طرح مل رہی ہیں۔ لاشعور Unconscious Mind کڑیاں ملاتا ہے اور شعور Conscious Mind ایک نتیجے کے اوپر پہنچ جاتا ہے۔ یہ وجدان Intuition، یا تاویل الاحادیث کہلاتی ہے۔

ایک واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے ہم سرسری طور پر آگے بڑھ جاتے ہیں، وہی واقعہ جب ان لوگوں کے سامنے آتا ہے، جو فنِ سیاست میں جذب ہوئے ہوتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! نظر آتا ہے کہ روس اور چین کی جنگ ہونے والی ہے۔

ایسا کہنے والوں کے سامنے کڑیاں ہوتی ہیں، جنہیں ملانے سے وہ جنگ کے نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ یہ کوئی علم غیب کی یا مافوق الفطرت بات نہیں ہوتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن نے یہی بات کہی ہے نہ کہ خوابوں کی تعبیر بیان کرنا۔ اقبال نے تاویل الاحادیث کے مفہوم کو ''آئینہ ادراک'' کے الفاظ میں بیان کر کے پیری مریدی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ واقعہ جو ابھی افلاک میں ہوتا ہے، کہیں مشہود نہیں ہوا ہوتا، ''عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے''۔ ادراک کے معنی Intellect ،شعور، فہم اور عقل ہوتی ہے کہ یہ ساری بات جو میں کہہ رہا ہوں یہ کوئی روحانیت، کشف اور کرامات کی بات نہیں ہے۔ آئینۂ ادراک اتنا مصفا ہو جاتا ہے کہ ایک واقعہ سامنے آتا ہے، تو وہ اس کی کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے اور کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے۔ بالعموم وہ نتیجہ صحیح نکل آتا ہے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت یوسف کے آئینۂ ادراک Intuition نے یعنی تاویل الاحادیث نے قحط سے بچنے کی تدبیر بتائی کہ یوں کیا جائے تو قحط کی سختیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے بھی یوسفؑ کا خواب سن کر، بیٹے کے اخلاق و اطوار سامنے رکھتے ہوئے تاویل الاحادیث کی رو سے کہہ دیا تھا کہ ''تیرا رب تجھے کسی عظیم مقصد کے لئے منتخب کرے گا، اور تجھے ایسی فراست عطا کرے گا کہ تیری نگاہ معاملات کے انجام و نتائج تک فوراً پہنچ جائے گی۔

نظریہ وجدان کا تنقیدی جائزہ:

مغربی مفکر لاک نے وجدان کے جبلت ہونے کے امکان پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کا کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا کہ:

1۔ اگر یہ تصدیقات جبلی یا وجدانی ہیں اور تجربے سے ماورا ہیں تو پھر انہیں انسانی ذہن میں یکساں طور پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر ایسا کوئی تصور نہیں جو آفاقی طور پر تمام اذہان میں پایا جاتا ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی چیز کا کسی ذہن میں ہونا دراصل اسی چیز کے معلوم ہونے کے ہم معنی ہے اور یہ کہنا کہ تصورات ذہنوں میں لاشعوری طور پر ہوتے ہیں۔ دراصل متضاد بالذات (Self-Contradictory) ہے۔

2۔ اگر خدا لامتناہیت، کاملیت کے تصورات قبل از تجربی اور وہبی ہیں تو ان تصورات کا ہر ذہن میں یکساں طور پر عرفان لازمی ہے۔

3۔ یہ نام نہاد قوانین بھی مخصوص تجربات کی تعمیم یا قاعدہ کلیہ (Generalisation) ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بچے کا یہ تجربہ کہ مٹھاس بہر حال مٹھاس ہی ہے اور کڑواہٹ بہر حال کڑواہٹ ہی ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے طور پر اس کی تعمیم یہی ہوگی کہ مٹھاس میں کڑواہٹ بہر حال نہیں ہو سکتی۔

ہیوم نے بھی یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ہر فرد کا ذہن پیدائش کے وقت ایک سادہ و صاف سلیٹ کی مانند ہوتا ہے۔ یا وہ کاغذ کا سادہ ورق ہوتا ہے جس پر کچھ بھی تحریر یا منقش نہیں ہوتا۔ ماحول اور تجربے کے بعد انسانی ذہن میں تصورات وغیرہ پیدا

ہوتے ہیں۔

وجدان بہرحال ایسی چیز تو ہے ہی نہیں کہ جانچی اور پرکھی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وجدانیت کے حکماء انسانی زندگی گزارنے کے لیے کسی قسم کا لائحہ عمل نہیں دے پائے۔

مُطلق اور مستقل اقدارِ حق کے معیار کا حصولِ علم نہ تو استدلالی اور نہ ہی غیر استدلالی علوم سے حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی محدود عقل سے بلکہ صرف خدا ہی کی رہنمائی کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔

راشڈل کی نظر میں حق کے مستقل اور مطلق معیار کا علم حاصل ہی نہیں ہوسکتا جب تک انسان خدا کے وجود پر ایمان نہ لائے۔ مطلق معیار کے معنی یہ ہیں کہ زمانے کے تغیرات اور احوال وظروف کے تبدّلات اس پر کسی صورت سے بھی اثر انداز نہ ہوں۔ وہ زمان ومکان کی حدود سے بالا ہو اور اس کا معیار خود اس کی اپنی ذات ہو۔ اس قسم کی اقدار ذہن انسانی (محدود ہونے کی بنا پر) کی پیداوار نہیں ہوسکتی خواہ وہ ذہن تمام حکمائے مغرب ہی کا کیوں نہ ہو۔ کانٹ نے بھی خیر کے معیار میں عقل نظری (عقل محض) پر انحصار کرنے کی بجائے عقل عملی کا سہارا لیتے ہوئے اسے بطور مسلمہ کے تناظر میں خدا کے وجود سے مشروط کر دیا ہے۔ عقل بغیر وحی کی روشنی کے، اپنے فریضہ بہبودِ خود بین ہی کے ''تحفظ خویش'' کے گرد گھومتی رہتی ہے اور اپنے مفاد سے آگے بڑھ کر مفادِ غیر دیکھ ہی نہیں سکتی، حُکمائے مغرب کے استدالی وغیر استدلالی دونوں کے تصورِ علم کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم قرآن کے علم بالوحی کا مُختصر طور پر جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم نے مطالعہ کرلیا ہے کہ قرآن کے مطابق انسانی جذبات کے دو حصّے ہیں؛

ایک وہ جذبات، جن کو انسان خدا کی طرف سے دیئے گئے علمِ جہاں بین (وحی) کے بغیر بروئے کار لائے۔ ایسے جذبات کی پیروی کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایسے جذبات کو انگریزی میں Irrational Passions کہتے ہیں، اور ان ہی کو ''بے باک جذبات'' بھی کہتے ہیں۔

دوسرے وہ جذبات ہیں، جن کو انسان، خدا کی طرف سے دیئے گئے علم یعنی وحی کی روشنی میں بروئے کار لائے۔ ایسے جذبات کی پیروی کا نتیجہ خوشگواری، سربلندی ہوتا ہے، مرتبے بلند ہوتے ہیں۔ ایسے جذبات کو انگریزی میں Rational Passions کہتے ہیں۔ Irrational وہ عقل ہے جو خود اپنا ہی تحفظ اور بھلا چاہتی ہے۔ اقبال نے Rational عقل کا نام ''عقل جہاں بیں'' رکھا ہے اور Irrational عقل کا نام ''عقل خود بین'' رکھا ہے۔

انسان کی نشوونما میں دو چیزیں ہیں، ایک اس کا جسم، اور دوسری اس کی ذات ہے۔ جسم کی نشوونما تو حیوانات کی طرح طبیعی قوانین کے تحت ہوتی ہے، لیکن انسانی ذات طبیعی قوانین کی دسترس سے باہر ہے۔ ذات کی نشوونما، ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے سے ہی ممکن ہے، جو خدا نے بذریعہ انبیاء عالم امر سے عطا کئے ہیں۔ لفظ رحمان ''فعلان'' کے وزن پر ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں کہ تدریجی رحم والی بات کو، تدریجی کڑیوں کے تسلسل کو، پھاند کر یکلخت نمودار ہو کر سامنے آجائے۔

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 12

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

عقیل الزماں اگر چہ عدالت میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے گھر والوں کا ساتھ دینے کے قابل نہیں تھے لیکن وہ ان کی ضروریات سے غافل بھی نہیں تھے چنانچہ انہوں نے شہر میں کسی ایک کیٹرنگ ایجنسی کے ذریعہ مجلس کے لئے کمرہ تیار کروا دیا۔ ایجنسی کے آدمی آئے انہوں نے صوفے اور کرسیاں دیواروں سے لگائیں، فرش پر قالین بچھائے اور دو درجن گاؤ تکئے سجا کر درمیان میں ایک بڑا سا گلدستہ رکھ کر چل دیئے اور کمرے کی فضا چشم زدن میں بدل گئی۔ دوسری طرف باورچی خانے میں گہما گہمی شروع ہوگئی۔ فضل کریم تو موجود ہی تھا لیکن مزید مدد کے لئے شبانہ بی بی کو بھی بلا لیا گیا کیونکہ کلیم الزماں گھر میں ایک میلے قسم کی خوشی سے شبانہ بی بی کو محروم رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ مہمانوں میں جو شخصیت سب سے پہلے پہنچی وہ شائستہ صاحبہ تھیں جن کے ہاتھ میں ایک بھاری بھرکم شاپنگ بیگ تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بیگ میں ایک کوری ہنڈیا ہے جس میں املی کی چٹنی ہے۔ تھوڑی دیر میں مہمانوں کا تانتا بندھ گیا جو بیس پچیس کے قریب ہوں گے۔ معلوم نہیں کہ اس کتبہ میں کیا کشش تھی جو دیواروں پر لگے ہوئے تھے کہیں خط نسخ میں کہیں خط نستعلیق میں اور کہیں خط گلزار میں کتبہ کیا تھا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ مذکور تھا کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114) سب لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ہر جگہ ایک ہی کتبہ کیوں ہے۔ کلیم الزماں نے مہمانوں کی متجسسانہ نظروں کو دیکھ کر کہا کہ آپ کو حیرت ہو رہی ہے کہ مجھے صرف یہ کتبہ کیوں مرغوب ہے۔ ہماری بات جب آگے بڑھے گی تو اس امر کی خود وضاحت ہو جائے گی کہ یہ آیت مجھے کیوں مرغوب ہے فی الحال میں یہ کہوں گا کہ یہ ڈوبتے ہوئے جہاز کا لنگر ہے۔ ایک بات آپ کے ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اگر میں کوئی بات ایسی کہوں جو آپ کے پروفیشن کو مذموم بناتی ہوئی دکھائی دے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا اطلاق سب سے پہلے مجھ پر ہوگا کیونکہ میں خود وکیل بھی رہا ہوں اور جج بھی۔ پچھلے دنوں ایک ملا نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے برصغیر کی امت مسلمہ کے تین ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان۔ اس ملا کے والد محترم نے کہا تھا کہ وہ پاکستان کے بنانے کے جرم میں شریک نہیں یہ بیانات پاکستان کی بنیادوں پر کلہاڑی مارنے کے مصداق ہیں۔ ایسی باتوں کا کورٹ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس کے برعکس ایک سیاست

دان کی سلپ آف ٹنگ پر ایک مقدمہ کی بنیاد رکھ دی۔ اگر کورٹ کے کار پر دازوں نے فرائڈ کی کتاب ''سائیکو پیتھالوجی آف ایوری ڈے لائف'' پڑھی ہوتی تو شاید یہ ٹنٹا کھڑا نہ ہوتا۔ میرا مطلب ہے کہ وکیل یا جج بننے کے لئے صرف قانون کی تعلیم کافی نہیں ہوتی اگر وکیل نفسیات، معاشیات اور عمرانیات کے دوسرے علوم سے بے خبر ہو تو وہ نہ تو اچھا وکیل بن سکتا ہے اور نہ ہی اچھا انسان۔ اگر وکیل مذکورہ علوم سے بے خبر رہے تو وہ ایک روبوٹ کی طرح Characterless ہوتا ہے۔ انگریزی کا یہ لفظ سن کر وکیل اوصاف علی چہک کر بول اٹھے اور کہا انکل! آپ نے وکلا کو Characterless کہہ کر بڑی بات کہہ دی ہے۔ اوصاف علی کی بات سن کر کلیم الزماں نے کہا کہ برخوردار استثناء کا معاملہ تو ہر گروپ میں ہوتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی رومن لاء کے مطابق پریکٹس کرنے والے وکلا کہیں بھی ہوں۔ سری لنکا، بھارت میں ہو یا پاکستان میں، ان کا پیشہ انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑتا، یہ کوئی فلسفہ کی بات نہیں شعر و ادب کا قصہ نہیں، فن لطیف کی بات نہیں، ہوا میں خیالی تیر چلانے کی بات نہیں پازیٹو سائنس یعنی شماریات (Statistics) کا فیصلہ ہے۔ اور وہ بھی ایسے کہ ہر مقدمہ میں ایک فریق حق پر ہوتا ہے دوسرا باطل پر۔ ایک وکیل حق کے مطابق دلائل دے رہا ہوتا ہے، اور دوسرا اسے باطل ثابت کرنے کے لئے خود بھی جھوٹ بول رہا ہوتا ہے اور اپنے مؤکل اور گواہوں سے بھی جھوٹ بلواتا ہے۔ یہ ڈراما ہر کورٹ میں ہر مقدمہ میں ہر روز ہر شہر میں ہوتا ہے یعنی اوسطاً ہر وکیل کی پیشہ ورانہ زندگی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ آدھی زندگی وہ حق کا ساتھ دیتا ہے اور اسکی آدھی زندگی باطل پرستی میں گزرتی ہے۔ اس طرح حق اور باطل برابر رہتے ہوئے حاصل ضرب صفر رہ جاتا ہے اور ایسا وکیل مقدمہ جیتنے کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں اور پندرہ بیس سال کی پریکٹس کے بعد خوش قسمتی سے اسے ہائی کورٹ کا جج بنا دیا جائے اور اس سے انصاف کی توقع ہو اور ایسا ہی ہے کہ جیسے کیکر کے درخت سے آم جیسا پھل حاصل کرنے کی توقع ہو۔ برخوردار میں جگ بیتی نہیں کہہ رہا، آپ بیتی بیان کر رہا ہوں۔ بھلا ہو اس نوجوان کا جو مسجد میں مجھے علامہ غلام احمد پرویز صاحب کے چند پمفلٹ دے گیا تھا اور شکر گزار ہوں اپنے بزرگ دوست صدیقی صاحب کا جنہوں نے مجھے مسئلہ ارتقا بیان کرتے ہوئے دین اسلام کی روح سے آگاہ کر دیا۔ جب انہوں نے مجھے اس شعر کی تشریح کر کے علامہ اقبال کا فلسفہ سمجھایا تو ایسے محسوس ہوا کہ مجھ پر وہی بجلی گری ہے جو وادیٔ سینا میں نخل سینا پر گری تھی اور وہ شعر ہے۔

خودی کا سرِّنہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں اتنی مدت سے شہر لاہور میں مقیم ہوں اور مجھے اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ گلبرگ میں ایک مینارہ نور تھا جس کے سایہ میں بیٹھ کر دین و دنیا دونوں کی آرائش کا سامان مہیا ہو سکتا تھا۔ دروں بینی سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کا ڈھانچہ کچھ اس قسم کا ہے کہ افسر شاہی ہو یا کوئی بڑا فوجی افسر اسے اپنے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ

جب کرنل صاحب کی وردی اترتی ہے تو اندر سے پنا کونکل آتا ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد سویلین بیروکریٹ کو تھانے کا محرر کرسی بھی پیش نہیں کرتا۔ کلیم الزماں یہ باتیں کررہے تھے کہ ایک وکیل صاحب نے کہا کہ انکل! ہم نے تو سنا ہے کہ علامہ پرویز نہ اولیاء کی کرامات کو مانتے تھے اور نہ ہی انبیاء کے معجزات کو اور مزید یہ کہ وہ حدیث کی صحت سے بھی انکار کرتے تھے؟

برخوردار! حدیث کے متعلق تو علما میں بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہی کا کہنا ہے کہ حدیث کی تقریباً پچاس کتابیں ہیں۔ ان میں کچھ احادیث ایسی بیان کی گئی ہیں جو نصوص قرآنی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ میں حضورؐ سے منسوب ایک روایت کے متعلق تمہارا فتوی چاہوں گا۔ حدیث نبویؐ ہے کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ سردی اور گرمی کیسے واقع ہوتی ہے، فرمایا! کہ جب دوزخ اندر سانس لیتی ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے اور جب سانس باہر نکالتی ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے۔ برخوردار اس روایت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو، یقیناً تم کہو گے کہ یہ حدیثِ رسول ﷺ نہیں ہوسکتی۔ اب معجزے کے متعلق بتاتا ہوں کہ سب سے بڑا معجزہ تو حضور ﷺ کی اپنی ذات ہے اور قرآن حمید ہے جس کا جواب آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی نہیں دیا جاسکا۔ حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ شق قمر بیان کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوکر زمین پر آیا، آدھا ایک بغل کے نیچے سے گزرا، آدھا دوسری بغل کے نیچے سے گزرا، دونوں آسمان پر جاکر باہم پیوست ہوگئے۔ یعنی معجزہ کی روایت گھڑنے والے نے چاند کو روٹی جتنا سمجھا۔ اگر آپ مانتے ہیں تو بے شک مانیں۔ نہ اسے میں مانتا ہوں اور نہ ہی علامہ پرویز مانتے تھے۔ میری نظر میں معجزہ دکھا کر کسی کو مسلمان کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے سینے پر پستول رکھ کر کہنا کہ، پڑھو کلمہ! ورنہ تیار ہوجاؤ۔ برخوردار اسلام عقل وخرد کا دین ہے۔ عقل کو عاجز کرکے جو ایمان لایا جاتا ہے وہ موم کی طرح جلدی پگھل جاتا ہے۔ اب رہی بات کرامات کی۔ اولیاء اللہ کی بہت سی کرامات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک کرامت یہ بیان کی جاتی ہے کہ خبر اڑی کہ نظام الدین اولیاء شیر پر سوار ہوکر بوعلی قلندر سے ملاقات کی غرض سے پانی پت آرہے ہیں۔ بوعلی قلندر مجذوب تھے۔ انہوں نے خبر سنی تو اس وقت وہ ایک دیوار پر بیٹھے تھے انہوں نے دیوار کو حکم دیا کہ نظام الدین اولیا کے استقبال کے لئے آگے چلو اور دیوار چل پڑی بوعلی قلندر ہی کے دیوان میں یہ بھی موجود ہے کہ ؎

جبرائیل چوں بہر نبوت برآمد
پیش آمد محمد و مقصود علی بود

ایک اور کرامت بھی بیان کی جاتی ہے۔ وہ اس قدر رومانی طور پر بیان کی جاتی ہے کہ عقل وخرد بھی بے ہوش ہوکر اسے ماننے کا ارادہ کرلیتی ہے لیکن حقیقت اپنے آپ کو خود منوالیتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانائے روم ایک حوض کے کنارے کتابوں کا ڈھیر لگائے اپنے شاگردوں کو درس دے رہے تھے کہ وہاں شمس تبریز آپہنچے۔ ان کی شکل و شباہت اجڈ دیہاتی ان پڑھ قسم کے انسان کی تھی۔ شمس تبریز نے پوچھا ''ایں چیست؟'' مولانا رومی نے نہایت نخوت سے جواب دیا ''ایں آنست کہ تو نمیدانی'' رومی کا یہ کہنا تھا کہ

کتابوں کا ڈھیر حوض میں جا گرا اور مولانائے روم کے منہ سے حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ فقرہ نکلا ''ایں چیست ؟'' شمس تبریز نے لفظ وہ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ایں انست کہ تو نمیدانی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس واقعہ کو شمس تبریز کی کرامت سمجھ کر مولانائے روم اس کے مرید ہو گئے کیونکہ اس واقعہ کو مولانا روم نے کوئی روحانی طاقت سمجھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ غلام احمد پرویز نے اپنی تصنیف ''تصوف کی حقیقت" میں ایک واقعہ لکھا کہ علامہ اقبال کے دولت کدہ پر بہت سے مہمانوں کی موجودگی میں جن میں علامہ تاجور نجیب آبادی بھی موجود تھے، لاہور کے ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر نے حاضرین کو حیرت زدہ کر دیا۔ جب انہوں نے میز پر پڑی ہوئی انگشتری کو آنکھ کے اشارے سے حرکت دی اور قلم کو کہا کہ وہ انگشتری میں سے نکل کر اپنے مالک کے پاس چلا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ڈاکٹر نے علامہ سے کہا کہ جوانی میں وہ سیر دو سیر وزن آنکھ کے اشارے سے اٹھا لیا کرتا تھا۔ اس قسم کے واقعات کو کرامت سمجھنا درست نہیں۔ یہ ایک فن ہے ابھی پچھلے دنوں ٹی وی پر ایک لڑکا دکھایا گیا ہے جس کے جسم میں مقناطیسی قوت تھی اور بیس پچیس کلو لوہا اس کے جسم سے چپک جاتا تھا۔ ٹی وی پر ہی ایک شخص کو آنکھ کی طاقت سے وزن اٹھاتے ہوئے دکھایا گیا۔ ایک اور واقعہ نے دیکھنے والوں کو حیران کر دیا۔ ایک شخص کے گرد تھوڑی سی تانبے کی تار کے چند چکر دیئے اور تار کے دونوں سروں کو ایک طشتری سے لگا کر ایک انڈا فرائی کر لیا گیا۔ گویا اس شخص کے جسم کو ٹرانسفارمر کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں انہیں کرامت سمجھنا جہالت ہے۔

حاضرین آہستہ آہستہ پکوڑے کھا رہے تھے اور بڑے انہماک سے کلیم الزماں کی باتیں بھی غور سے سن رہے تھے کیونکہ "بار" کے لوگوں کے لئے یہ باتیں الف لیلائی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک پکوڑا ہاتھ میں لئے مریم کیانی نے کہا کہ انکل آپ کی باتیں آپ کے پکوڑوں سے زیادہ لذیز ہیں۔ جس پر کلیم الزماں نے ہنستے ہوئے کہا بیٹی تم نے شائستہ کی املی والی چٹنی استعمال نہیں کی ہوگی۔ مریم نے کہا نہیں انکل! میں نے وہ بھی استعمال کی تھی۔ جو چٹنی میں بنا کر لاؤنگی اسے آپ دیکھئے گا کہ آپ کے ہونٹ خطرے میں پڑ جائیں گے۔ مریم کیانی کی بات سن کر کلیم صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو گویا ایڈوانس بکنگ کر رہی ہیں۔ بیٹی جب چاہو تم آسکتی ہو لیکن پنیر والے پکوڑے نہیں ملیں گے کیونکہ مجھے بار بار صدیقی صاحب کو زحمت دیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی اثناء میں بہت سے مہمانوں کی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی اور کہیں کہیں پکوڑوں کی کاغذی ڈش اپنی جگہ پر کانپتی نظر آتی تھی۔ کلیم صاحب نے فضل کریم کو آواز دی اور اسے گرم گرم چائے اور مزید پکوڑے لانے کے لئے کہا۔ پھر مریم کیانی کی طرف منہ کر کے کہا کہ آپ لوگ جب چاہیں تشریف لا سکتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میرا غریب خانہ ایک تبلیغی رائے ونڈ بن جائے اور ایسی ونڈ چلے کہ لوگ ہماری رائے سے متفق ہو جائیں۔ علامہ اقبالؒ کا ایک شعر ہے جو فلسفہ تاریخ پر گہری نظر رکھنے والا ہی کہہ سکتا تھا شعر ہے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

لیکن عوام الناس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ یورپ

ایک زمانہ میں مذہبی خرافات سے بھرے افسانوں کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور جب مارٹن لوتھر نے اپنی تحریک اصلاح دین شروع کی تو اس پر اعتراض اٹھے کہ یہ شخص لادین ہے اور عیسائی معاشرے میں اسلامی خیالات وتصورات کی تبلیغ کر رہا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی اور اس کے بعد تک زمین کو کائنات کا مرکز مانا جاتا تھا اور عوام یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اب تو سکول کا بچہ بھی اس حقیقت سے باخبر ہے۔ گلیلیو کو اس امر کی پاداش میں سزائے موت کی دھمکی دی گئی کہ وہ زمین کو مرکز کائنات ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ اس کی کرامت تھی کہ آج یورپ اقوام عالم میں سب سے محترم مانا جاتا ہے۔ برصغیر کو دیکھ لیجئے یہاں قدم قدم پر صاحبان کرامات مدفون ہیں۔ دہلی میں نظام الدین اولیاء، اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی، کلیر میں حضرت صابر صاحب، پاک پٹن میں بابا فرید الدین شکر گنج لاہور میں حضرت داتا گنج بخش اور میاں میر، خیبر پختونخوا میں حضرت کاکا صاحب۔ انگریز دوسو سال تک ہندوستانیوں کے سروں پر جوتیاں برساتا رہا اور کوئی صاحب کرامت انہیں روک نہ سکا۔ لیکن ایک بندہ مومن جو سر پر سفید رنگ کا ہیٹ پہنتا تھا جس کا جوتا بھی آکسفورڈ کٹ کا ہوتا اور جو سگریٹ بھی کریون اے کا پیتا تھا، ایک چھوٹا سا ٹائپ رائیٹر لے کر اٹھا اور سات سال کی قلیل مدت میں ایک نئی قوم کو وجود بخش گیا۔ یہ تھی کرامت، ایسی کرامت کو تو پرویز اور علامہ اقبال دونو ں مانتے ہیں۔ اسی لئے تو انہوں نے کہا تھا کہ" ہے بندہ مومن خود اک زندہ کرامات" مگر اس قوم میں بیماری کے جراثیم باقی ہیں۔

ایک بہت بڑے صحافی بلکہ صحافیوں کے استاد نے دو دفعہ ٹی وی پر یہ دعویٰ دہرایا ہے کہ قائداعظم اثنا عشری تھے حالانکہ ایک جلسہ میں جب کسی نے ڈائریکٹ طور پر قائداعظم سے پوچھا تھا کہ آپ سنی ہیں یا شیعہ تو ان کا جواب تھا کہ میں وہ ہوں جو پیغمبر اسلام خود تھے۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کلیم الزماں نے حاضرین سے کہا کہ میری تحریک نخل سینا اسی ذہنیت کو مٹانے کا پروگرام رکھتی ہے اور میں اسی مہم کے لئے آپ لوگوں سے اعانت کی امید رکھتا ہوں۔ دامے درمے نہیں بلکہ سخنے اور قدمے۔ میرے پاس بلیک منی بہت ہے۔ اسے میں ان الحسنات یذھبن السیآت کے نسخے سے وائٹ کر رہا ہوں۔ پھر ہنستے ہوئے کہا کہ آپ سب وکیل بھی ہیں اور بار اور بنچ دونوں سے واقف بھی۔ کلیم صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں تو پرانے زمانے کا آدمی ہوں اور میں نے تعلیم اس زمانے میں حاصل کی تھی جب علم کی سطح اتنی بلند نہیں تھی جتنی آج ہے۔ آجکل تو نوجوان بوڑھوں سے عقل وخرد میں آگے بڑھ گئے ہیں۔ میں نے آپ ہی جیسے لوگوں سے سن کر کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کی روشنی میں چند شعروں کا مطلب سمجھانے کا اپنی بیٹی عالم آرا سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اسی محفل میں بیان کرتا ہوں کہ شاید آپ لوگوں میں سے کوئی میرے علم میں اضافہ کر سکے۔ کلیم صاحب کی بات سن کر عاصمہ فاروقی نے پوچھا کہ انکل بہن عالم آرا آپ کی بیٹی ہیں یا بہو۔ آپ اسے بیٹی بیٹی ہی کہہ رہے ہیں اور یہ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی پڑوسن کہہ رہی ہے کہ عالم آرا انکل کی بہو ہیں۔ کلیم الزماں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بیٹی عالم آرا میری بہو ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ

جو شخص بہو اور بیٹی میں امتیاز کرے تو اسکے جسم میں کراموسومز کی تعداد مشکوک ہو جاتی ہے۔ اچھا آمدم برسر مطلب، علم اور فکر و فلسفہ کی ابتداء کہا جاتا ہے کہ یونان میں ہوئی۔ شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ کائنات چار اجزا کا مجموعہ ہے۔ آگ پانی ہوا اور مٹی لیکن دیموقراطیس نے اپنے ہم وطنوں سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ کائنات چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہے۔ مثلاً آپ لکڑی کے کوئلے کو توڑتے جائیں تو وہ ذروں کی شکل اختیار کر لے گا۔ مزید توڑتے جائیں تو ایک سٹیج ایسی آئے گی کہ وہ ذرہ توڑا نہیں جا سکے گا۔ دیموقراطیس نے کہا کہ کائنات ایسے ہی ذرات سے بنی ہے۔ لکڑی کے ذرات، لوہے کے ذرات، سونے اور چاندی کے ذرات تو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ انسانی علم اسی تصور کے تحت آگے بڑھا اور اسی تصور نے وہ تہذیب پیدا کی جسے مادی تہذیب کہا جاتا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر مولانا محمد حسین آزاد ایران گئے۔ وہاں میزبان کے گھر ہنڈیا میں جوش آیا ہوا تھا اور ہنڈیا کا ڈھکنا بار بار اٹھتا تھا۔ میزبان کے بچے نے اپنی ماں کو اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ مادر دیگچہ سرمی کند۔ مولانا جب واپس ہندوستان آئے تو یہ محاورہ بھی ساتھ لائے اور سخندان فارس لکھ دی لیکن انگلستان میں جب جیمز واٹ نے دیگچی کے ڈھکنے کو سرنکالتے دیکھا تو اس نے اس جن کو فوراً قابو کر لیا۔ پھر کیا تھا یورپ میں ہوا سے چلنے والی چکیاں ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ بھاپ سے چلنے والی چکیاں چلنے لگیں اور ان چکیوں سے ٹوں ٹوں کی نکلنے والی آواز شاعر ورڈزورتھ کی نظموں کا موضوع بن گئی۔ سٹیفن سن نے سوچا کہ وہ کیوں پیچھے رہ جائے، چنانچہ اس نے بھاپ سے چلنے والے انجن سے ریل گاڑی ایجاد کر دی۔ برصغیر ہندو پاک میں دنیا کا سب سے بڑا ریلوے کا نظام اس بھاپ کے انجن سے چل رہا تھا۔ الغرض انسان نے فطرت کی طاقتوں سے بڑا کام لیا ہے اور بے شمار ایجادات کی وجہ سے اس قدر مغرور ہو گیا کہ خدا کو بھی بھول گیا۔ اس نے دعوی کر دیا کہ دنیا ایک گھڑی کی طرح چل رہی ہے جسے کوک دیا گیا اور اب حاصل کردہ علم کی بناء پر ہر قسم کے واقعہ کی پیشگوئی کی جا سکتی ہے لیکن علم کا دریا کہیں رکتا نہیں۔ کم فہم سیاست دانوں اور سائنس دانوں نے نیوٹن کے قوانین کو حرف آخر سمجھ لیا تھا۔ ایک اللہ کے بندے نے جس کا نام لارڈ ردرفورڈ (RutherFord) تھا۔ سونے کے ورق پر الیکٹران کی بمبارمنٹ کر کے سونے کے ایٹم کو توڑ دیا۔ اور اس طرح اس نے مادی تہذیب کی بنیادیں ہلا دیں کیونکہ سونے کا مادی ایٹم الیکٹرون اور پروٹون میں تبدیل ہو کر فضا میں گم ہو گیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ کائنات کی بنیادی ساخت مادی نہیں روحانی ہے۔ الیکٹران ہر وقت پروٹون کے گرد گھومتے رہتے ہیں لیکن یہ متعین نہیں ہو سکتا کہ کونسا الیکٹران کسی خاص لمحہ میں کس مخصوص دائرے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہر قسم کے واقعات میں ہر واقعہ کے متعلق پیش گوئی نہیں کر سکتے کہ فلاں واقعہ ضرور ہو کر رہے گا۔ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کلیم الزماں نے کہا کہ میں نے تو سائنس پڑھی ہے اور نہ ہی اس کے اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ سطحی معلومات ہیں۔ اگر میں نے کہیں غلطی کی ہو تو آپ میں کوئی صاحب یا صاحب اس کی تصحیح کر سکتے ہیں۔ میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا

ہوں کہ کائنات کی بنیاد روحانی ہے اور اس کی ساخت الیکٹران اور نیوکلیس سے کائنات کی ہر شے میرے اور آپ سب کے سمیت اسی میٹریل سے بنی ہے۔ پوری کائنات الیکٹرومیگنیٹزم کا کھیل ہے۔آپ میں سے کسی کے پاس موبائل فون ہے؟ کلیم الزماں صاحب کے سوال پر وکیل سعیدہ درانی بول اٹھیں کہ انکل! میرے پاس ملٹی پرپز آڈیو وڈیو موبائل ہے اور آپ جو کچھ فرما رہے ہیں میں نے سب ریکارڈ کر لیا ہے۔ سعیدہ درانی کی بات سن کر کلیم الزماں اچھل پڑے اور کہا بیٹی! تم نے میرا کام آسان کر دیا ہے، پھر حاضرین کی طرف دیکھ کر کہا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ان الیکٹرانک آلات میں کسی میٹل کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جسے سم کہا جاتا ہے اور سائز میں وہ عموماً ایسی ہوتی ہے جسے پنجابی میں چھلتر کہا جا سکتا ہے اور اسی چھلتر میں یا میموری کارڈ میں پوری داستان الف لیلیٰ ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔اس پر کامران نے مصرع لگایا کہ الف لیلیٰ کو چھوڑیئے انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا سما سکتا ہے۔

کلیم الزماں: اگر ایسا ہے تو سمجھ لو کہ آپ کے جسم میں آپ کی ساری داستان حیات محفوظ ہے کیونکہ میٹل کی چھلتر تو مردہ ہے اور ہمارے جسم کا ہر ٹشو زندہ ہے اور زندہ مردہ کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ میں تو یہ تصور کرتا ہوں کہ آئندہ سو سال میں یا پانچ سو سال میں ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے کہ ملزم کے ناخن کا ایک ٹکڑا میموری کارڈ کا کام کرنے لگے گا اور عدالت کو گواہوں کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

کلیم الزماں یہ باتیں کر رہے تھے کہ عبداللہ منصور اٹھ کھڑے ہوئے پوچھنے پر بتایا کہ واش روم جائیں گے۔کلیم الزماں نے فضل کریم کو بلا کر ان کے ساتھ کر دیا۔ان کے جانے کے بعد اوصاف علی بول اٹھے کہ انہیں اپنے کرتوت یاد آ گئے ہیں۔اس پر کلیم الزماں نے کہا کہ ایسا نہ کہو کہ اگر بات دل میں گھر کر جائے تو اسے خدا کا فضل سمجھنا چاہیے۔تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حشر کے میدان میں قیامت برپا ہوگی تو ہمارے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء ہمارے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ایک عام آدمی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ زبان تو بولتی ہے ہاتھ پاؤں کیسے بولیں گے۔سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ہر انسان کا اعمالنامہ اس کے گلے میں لٹکا ہوگا اور اس سے کہا جائے گا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ (17:14) پڑھ اپنی کتاب آج کے دن اپنا حساب کرنے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔ یہ تو قیامت کی بات تھی۔سائنسدانوں نے تو انسان کے لئے اسی دنیا میں قیامت برپا کر دی ہے شاید اسی قسم کے تصور کے ماتحت علامہ نے فرمایا تھا۔

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی
ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

اس قسم کے حالات کو دیکھ کر قرآن مجید کی وہ آیت یاد آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے یہاں تک کہ حق ان پر واضح ہو جائے۔

کلیم الزمان کی باتیں سن کر شائستہ نے کہا کہ انکل اگر ہم مہینے دو مہینے کے بعد کورٹ سے ہڑتال کر لیا کریں تو کیسا رہے گا جس پر کلیم الزماں نے ہنستے ہوئے کہا کہ بیٹی تمہیں ہڑتال کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بات کو پلٹتے ہوئے

کلیم الزماں نے کہا کہ آپ میں اگر کوئی صاحب یا صاحبہ شاعر ہیں تو کچھ تفنن طبع کے لئے ہو جائے۔ عبداللہ منصور نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ انکل قانون کی کتابیں پڑھنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ شعر و شاعری دور کی بات ہے۔ اس پر کلیم الزماں نے کہا کہ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں علم و ادب کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سرسید احمد خان نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک قرق امین کی حیثیت سے کیا تھا لیکن جوش وجذبہ کا یہ عالم تھا کہ علی گڑھ میں سکول اور کالج کی بنیاد رکھتے ہوئے کیا کہا تھا! شائستہ بیٹی تم بتاؤ، مریم کیانی صاحبہ بتائیں گی یا اوصاف علی صاحب؟ جب سب خاموش رہے تو کلیم صاحب نے کہا کہ سرسید نے علی گڑھ کالج کے متعلق کہا تھا کہ!

نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم

یہ یونان کیا تھا؟ علی گڑھ کا مدرسہ یا کالج؟ اسی تعلیمی ادارے کی کوکھ سے پھر دہلی کی جامعہ ملیہ اعظم گڑھ یعنی مرحوم شبلی کا ندوہ، کراچی میں سندھ مدرسہ، لاہور میں اسلامیہ کالج، انجمن حمایت اسلام اور اس کے برگ و بار اور سرحد میں اسلامیہ کالج۔ اس تحریک نے بڑے زعماء پیدا کئے جن کے ناموں سے آپ سب واقف ہیں اور قائداعظم اس تحریک کے گل سرسبد گل ہیں۔ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی سیاسی اور معاشرتی بدحالی سے نجات دلا کر انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ آزادی تو مل گئی اور پاکستان ایک آزاد مملکت کے طور پر وجود میں آ گیا لیکن سیاسی معاشی اور معاشرتی بدحالی دور نہیں ہوئی جسے قرآن مجید نے "فك رقبه" کہا ہے یعنی لوگوں کو مختلف قسم کی غلامی کی زنجیروں کی قید سے آزاد کرانا اور معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عوام کے لئے یہ زنجیریں موجودہ وقت کے فرعون، ہامان اور قارون تیار کرتے رہتے ہیں۔ یہ کام بہت مشکل ہے جسے قرآن مجید نے گھاٹی پر چڑھنے سے تشبیہ دی ہے۔ بات صاف ہے پہاڑی پر دوڑ کر چڑھا نہیں جا سکتا لیکن یہ کام کرنا ہے جو آپ کی نخل سینا تحریک کرے گی۔ معلوم نہیں کہ یہ تحریک کتنی نسلوں کے بعد کامیاب ہو۔

صدیقی صاحب کا بات سمجھانے کا طریقہ بڑا عجیب اور خوبصورت ہے۔ انہوں نے اپنا ایک قصہ سنایا کہ جب وہ جماعت چہارم میں پڑھتے تھے تو ان کے ساتھ ان کے پڑوسی تھانیدار کا لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ اسکا بڑا بھائی پانچویں جماعت میں تھا دونوں بھائی پرلے درجے کے نالائق تھے۔ اس زمانہ میں انگریزی کے ابتدائی قاعدے بڑے اچھے چمکدار کاغذ پر چھپے ہوئے انگلستان ہی سے آتے تھے۔ کتاب کے پہلے یا دوسرے صفحہ پر ہاتھی کی تصویر تھی اور ساتھ ایک آدمی بندوق لئے کھڑا تھا۔ ہاتھی کے ساتھ انگریزی میں ایلی فینٹ اور آدمی کے ساتھ ہنٹر لکھا تھا۔ بڑے بھائی صاحب نے الفاظ کی آواز کی مناسبت سے ہنٹر اور ہاتھی یاد کر لیا اور یہی بات اس نے مجھے اور میرے ہم جماعت کو پڑھا دی کہ ہنٹر کا مطلب ہاتھی اور ایلی فینٹ کا مطلب شکاری۔ صدیقی صاحب کہتے ہیں کہ جب میں پانچویں کلاس میں پہنچا اور استاد صاحب نے پڑھایا کہ ہنٹر کا مطلب شکاری اور ایلی فینٹ کا معنی ہاتھی ہیں تو میرا پہلا

تاثر یہ تھا کہ استاد صاحب کو انگریزی نہیں آتی۔ آخر کار یہ تاثر زائل ہو تو گیا لیکن منہ کا مزہ بگڑا ہی رہا۔ صدیقی صاحب کا کہنا ہے کہ ہماری پوری قوم اسی قسم کے تاثر میں مبتلا ہے۔ آج سے ہزار بارہ سو سال پہلے جو کچھ ان کو سمجھا دیا گیا تھا لوگ اس تصور کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، لوگوں نے کچھ غلط سلط عقیدے قائم کر لئے ہیں۔ اگر انہیں سمجھانے کی کوشش کرو تو کہتے ہیں کہ تم مرتد ہو۔ گردن زدنی ہو۔ غضب کی بات ہے کہ آج بھی جب کہ علم کی روشنی ہر چیز کو نمایاں طور پر دیکھنے کے لئے وسائل مہیا کر چکی ہے ہمارے ٹی وی چینل حقیقت کی نفی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر اس وقت معاشرے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جرنیل حضرات اور حکومت کے دوسرے بڑے افسر جنہیں بیوروکریٹ کہا جاتا ہے سازشوں میں مصروف ہیں یا پلاٹو فوبیا کا شکار ہیں۔ آجکل کا استاد استاد نہیں رہا دکاندار ہو گیا ہے۔ تاجر حضرات ادھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال ادھر کرنے میں سرگرداں ہیں۔ سیاست دانوں کو جعلی ڈگریاں ہاتھ میں لئے ہوئے شرم نہیں آتی۔ عوام میلاد شریف کی محفلوں اور مذہبی جلسوں میں شرکت کو ہی اسلام سمجھے ہوئے ہیں اور اسلام کے تقاضوں سے مطلقاً بے خبر ہیں۔ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کو ہی عبادت سمجھتے ہیں حالانکہ مسلمان کو مسجد میں اسلئے جانا چاہیے کہ وہ عبادت کے طور طریقے اور عبادت کے مقصد کو سمجھے، اس کی اصلی عبادت اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ مسجد کے دروزاے سے باہر نکل رہا ہوتا ہے یا مسجد کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا ہوتا ہے۔ علما کا حال تو آپ لوگ جانتے ہیں کہ ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا ہی نہیں'' وہ رویت ہلال کے موقعہ پر امیر مینائی کساتھ یہ کہتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں کہ

نالہ اگر کرے تو سمجھ بوجھ کر کرے
بلبل سے کوئی کہدے کہ ہم بھی چمن میں ہیں

قوم کی اسی حالت کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ نے بڑے درد مندانہ الفاظ میں کہا تھا

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس رہے ہیں فقط ایک مردِ راہ داں کے لئے

کلیم الزماں کی باتیں سن کر حاضرین پر چند لمحوں تک سکتہ کا عالم رہا پھر شبیہ الحسن نے کہا کہ انکل! یہ سب کچھ کیونکر ہوا اور کیا اس انحطاط کا کسی طرح ازالہ ہو سکتا ہے؟ کلیم صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ برخوردار! تم نے دو سوال کئے ہیں۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ تربیت لازمی ہے۔ بعد میں آنے والے حکمرانوں سے یہی کوتاہی ہوئی کہ وہ نئے نئے مسلمانوں کی تربیت نہ کر سکے۔ اسی کوتاہی کی وجہ سے خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنی۔ یہی کوتاہی ان سیاست دانوں اور سیاسی ورکروں سے ہوئی جو پاکستان کے حصول کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کا نعرہ تھا پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔ ہر فرد کی زبان پر یہی نعرہ تھا۔ سیاست دانوں کو تو وقت ہی نہ ملا کہ قوم کو لا الہ الا اللہ کا مطلب بھی سمجھا دیں اور جو سمجھا سکتے تھے وہ زیادہ تر اس جنگ سے دور رہے بلکہ مخالف کیمپ میں رہے اور اس لا الہ الا اللہ کے مطلب سے بے خبری کی وجہ سے پاکستان بنتے ہی لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا جس میں

، میں بھی شریک تھا۔ اسی فروگزاشت کا صدقہ ہے کہ آپ کو پنیر کے پکوڑے کھانے کو مل رہے ہیں کیونکہ مجھے اپنا وظیفہ ہر وقت یاد رہتا ہے بلکہ اس کی یاد مجھے ہر وقت پریشان رکھتی ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114)

شائستہ نے کلیم الزماں کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا کہ انکل! آئندہ کا پروگرام کیا ہے؟

کلیم الزماں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ بیٹی! اگر پکوڑوں کا پروگرام پوچھ رہی ہو تو وہ تم نے بتانا ہے اور اگر میرا پروگرام پوچھتی ہو تو میں سوچتا ہوں کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔ یہاں تک تو قائداعظم یا علی گڑھ تحریک نے پہنچایا ہے، میں چاہتا ہوں کہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھے اور اس قوم کو لا الہ الا اللہ کا مطلب سمجھا دے اور جو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کی نگارشات کا مطلب قوم کے بچے بچے کے کانوں تک پہنچا دے۔ میرا مطلب ہے کہ علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویز کے نقطہ نظر کی ترجمانی ایسے الفاظ میں کی جائے کہ بات عام آدمی کے دل میں اتر جائے اور ایسا اسی وقت ہو سکے گا جب تک علامہ کا یہ قول سامنے نہ ہو کہ

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہوا دراک

شبیہ الحسن نے سوال کرتے ہوئے کہا کہ انکل! سب کچھ کیسے ہوگا؟ تو کلیم صاحب نے کہا کہ برخوردار! اس کا جواب بھی کلمہ میں موجود ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا رومیؒ کی بات کو بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

گفت رومی بر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

شبیہ الحسن صاحب! آپ وکیل ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہمارے دستور سے واقف ہونگے۔ قرآن مجید کی سورہ مائدہ میں ایک آیت ہے۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿44:5﴾ اور آگے چل کر انہیں فاسق اور ظالم بھی کہا ہے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمارے دستور کی تمام شقیں قرآن مجید سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔ میں خود وکیل بھی رہا ہوں اور جج بھی، میں جانتا ہوں کہ آپکا جواب نفی میں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بحیثیت قوم کافر بھی ہیں، فاسق اور ظالم بھی۔ قرآن مجید میں ایک اور آیت بھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ انتباہ کر رہا ہے کہ، دیکھنا! مشرک نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جنہوں نے آپس میں اختلاف کیا اور پارٹیوں میں بٹ گئے اور ہر پارٹی خوش ہے کہ صرف وہی حق پر ہے۔ اگر ہم سیاسی، مذہبی اور دوسری قسم کی پارٹیوں کا اندازہ لیں تو امت مسلمہ میں پارٹیوں کی تعداد ایک سو چودہ سے تجاوز کر جائے گی یعنی ہفتاد و دو کا ڈبل اور ہمارے دستور میں ان مختلف قسم کی پارٹیوں یعنی فرقوں کو تسلیم کر لیا گیا ہے یعنی مشرکوں کو مسلمان مان لیا گیا ہے، جو صریحاً خلاف قرآن ہے۔ شبیہ الحسن صاحب آپ کیا کہیں گے اس معاملہ میں؟

شبیہ الحسن صاحب! بعض آیات قرآنی تو ایسی ہیں کہ ان کو پڑھ کر دل دھڑکنے لگتا ہے۔ یہ بات گھر میں پرائیویٹ

طور پر ہو رہی تھی اور میں اپنی بیٹی عالم آرا کو قرآن مجید کے چند نکات بتا رہا تھا کہ آپ اصحاب کی ہڑتال نے معاملہ لمبا کر دیا۔ قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے جس میں حضور ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ ''جن لوگوں نے آپس میں اختلاف کیا اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں''۔ کہیے! آپ اس معاملہ میں کیا کہتے ہیں؟

فائنل تجزیہ میں ہم کافر بھی ہیں فاسق بھی، ظالم بھی مشرک بھی اور رسول اللہ ﷺ کا ہم سے کوئی واسطہ بھی نہیں، پھر بھی دستور میں موجود ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائیگا۔ ایک دیانتدار تاریخ دان سے اگر ہم فتویٰ لیں تو وہ ایک لفظ میں یہ کہہ دے گا کہ یہ سب منافقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پوری قوم منافقت کی زندی گزار رہی ہے سوائے ایک شخص کے جس نے اعلانیہ احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا کہ

ایسے دستور کو صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

شعر سنتے ہی حاضرین قہقہہ لگاتے ہیں لیکن فوراً محسوس ہوا کہ جیسے گلا گھٹ رہا ہے۔ اوصاف علی نے پوچھا کہ انکل اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، قوم سے بڑی غفلت ہوئی ہے؟ تو کلیم صاحب نے کہا کہ اس کا علاج اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ پوری قوم اور اس کے اداروں کو دوبارہ کلمہ پڑھا دیا جائے اور ساتھ ہی انہیں غالب کی سرزنش یاد کرائی جائے کہ

ز نہار از آں قوم نہ نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

(مفہوم: ڈرو اس قوم سے کہ جو اللہ کو فریب دیتی ہے سجود سے اور نبی ﷺ کو ہے درود سے)

وقت کافی ہو گیا تھا۔ عبداللہ منصور نے پوچھا کہ انکل پھر آئندہ کیا پروگرام ہوگا؟ اس پر کلیم صاحب نے کہا کہ آپ جب چاہیں کورٹ سے ہڑتال کر کے آسکتے ہیں۔ غریب خانہ ہر وقت آپ کیلئے کھلا ہے اور اگر نخل سینا کے پروگرام کے متعلق پوچھ رہے ہو تو تھوڑی سی شرم کر لو۔ پنیر کے پکوڑے ہی حلال کر لو۔ کچھ تو اپنی طرف سے بھی کہو کہ آئندہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں تو تعلیمی نظام کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فوقیت دینی چاہیے اور تعلیمی نظام سے میرا مطلب نصاب تعلیم نہیں وہ تو جو قوم کا تعلیمی نصاب ہوگا ہمیں بھی وہی اختیار کرنا پڑیگا۔ اس پر مریم کیانی نے کہا کہ انکل آپ خود ہی وضاحت فرمادیں کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ کلیم صاحب نے کہا کہ! جب بہت سے دماغ سوچتے ہیں تو کوئی نہ کوئی نیا راستہ نکل ہی آتا ہے، اسلئے میں جانتا ہوں کہ آپ جب بھی پروگرام بنائیں اپنی تجاویز بھی ساتھ لائیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم انشاء اللہ کسی بہتر نتیجے پر پہنچیں گے۔ آپ پرسوں کا پروگرام رکھ لیں۔ پرسوں اتوار ہے ہڑتال بھی نہیں کرنا پڑے گی۔ سب لوگ فارغ ہونگے، میں بھی اپنی طرف سے کچھ پروگرام کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کرونگا اور سب کی قطع و برید سے انشاء اللہ کوئی اچھا لائحہ عمل تیار ہو جائیگا۔ اسکے بعد حاضرین نے رخصت چاہی اور نشست اختتام کو پہنچی۔

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیرِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بجھوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جا سکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہوچکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-
سورہ آل عمران (اوّل)	(3)	472	500/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-
سورۃ الانفال	(8)	210	250/-
سورۂ توبہ	(9)	530	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-
سورۂ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-14-15)	500	500/-

سورۃ النحل	(16)	334	300/-
سورۃ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-
سورۃ الکہف، سورۃ مریم	(18-19)	532	500/-
سورۃ طٰہٰ	(20)	416	350/-
سورۃ الانبیاء	(21)	336	300/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ روم، لقمان، السجدہ	(30-31-32)	444	400/-
سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	(33-34-35)	570	400/-
سورۃ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ الصفٰت، ص، زمر	(37-38-39)	450	400/-
سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40-41-42)	624	550/-
سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	500/-
سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49--51-50-52-53)	550	500/-
سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55-56-57)	384	400/-
28واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	-64-65-66) (58-59-60-61-62-63	300	300/-
29واں پارہ (مکمل)		544	400/-
30واں پارہ (مکمل)		624	400/-
شرح جاوید نامہ		800	1000/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

Principle for Success and Reasons for Downfall – By Sir Syed, 1896

(ترقی کے اصول اور تنزل کے وجوہ)

(Translated by: Mansoor Alam)

[*Maqalaat-e Sir Syed; Ed. Maulana Ismail Panipati;* ***Publisher, Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, Lahore, 1963]***

The old system of education cannot inculcate character attributes in students required for our times; nor can it create fortitude, self-respect, and self-control in students; nor can it engender love, dignity, and sympathy for our nation so essential for our people's future progress and welfare. In those days the teachers and the students had similar thinking as the rulers, so the mosques and school systems became their echoes. But these days everything has changed – the structure of government, composition of nation, system of governance, and means of delivery and welfare of common masses. So, unless we change and do not move and adjust with the times, how can we expect to succeed?

There are large number of students and children of noble families who need lot of help. Our leaders and rich and those who want progress and development of our people must help these children to acquire education, but not via the old system of education but by establishing a new system of education that I just described. This new system will preserve their dignity and self-respect along with providing them quality modern education. These students must live in dorms with proper rules and regulations so that they can learn discipline and build self-confidence, and march onward on their educational journey with fortitude; and become useful and productive members of society.

It is a common refrain from the proponents of status quo that the emphasis which is being placed on our nation's progress in these days had never been placed before: schools are opening regularly; new orphanages are being opened as never before; large numbers of Islamic organizations are being established at a breakneck speed though they start disappearing after a short while. But it is sad that the same dependence and subjugation of our nation continues, the eradication of which these efforts were supposed to be directed at. So, what does this scenario teach us? Can these old ways will work to pull our people out of humiliation and subjugation? Never! Usual ways will never work. Instead, these will create even more examples of our nation's misfortune

and failure as a people.

A famous traveler has said that if one wants to know a nation's condition of whether it is moving on a path of progress and freedom or a path of humiliation and subjugation – then it is enough to see their graveyards and their places of worship. If their graveyards are well taken care of and are manicured, and their places of worship are well attended under good and clean and well-organized environment, then one could be sure of that nation's respectable wellbeing. But there are other indicators when it comes to India to judge a nation's condition, and they are its Islamic schools; its Islamic organizations; its orphanages – because in them are found signs of our nation's starkest humiliation and degradation.

O respected elders of my nation! If you all, with complete trust, work together then you will be able to generate power and strength that was not available to Harun Rashid; nor to Mamun Rashid; nor to Akbar; nor to Shahjahan; and nor is it available even to the present highly competent British government – provided you give 2% of your income and spend it on just one cause with firm conviction, harmony and focus, instead of smattering your power and resources working on multiple uncoordinated ill-conceived projects. Then you will see that you will be able to complete grand tasks even more grandeur than Europe's. But it is sad that we are not steadfast in our goals. If we are steadfast then we are not wholly magnanimous. This is the reason that all our efforts degenerate into miscarriage and nothing useful happens to our nation. Moreover, it hastens our momentum towards our nation's decline and failure. As Allah conveyed through the Prophet (PBUH): قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاء وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاء وَتُعِزُّ مَن تَشَاء وَتُذِلُّ مَن تَشَاء بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (3:26) – O Messenger! Tell them that no nation is Allah's favorite. Everyone is treated according to His Laws which lay down that everyone will get the reward of what he has striven for. Status and position is also determined according to one's deeds. So whoever violates them deprives himself of authority and honor. He has laid down these measures to regulate everything and all this is for the good of humanity. [Exposition]

Religious superstitions and prejudices are also impediments to our nation's progress and welfare. Whether or not they are able to, but we should expect our religious scholars to eradicate these evils. This will provide peace and security for our nation to channel its energy in positive and constructive direction. I remember vividly that when railway trains started then an issue was raised as to whether or not praying in train was appropriate. Our religious scholars gave the fatwa that it was not. Then

grand discussion started: since stopping a train was not in our hands and by the time a train stops prayer time may have already past – a fatwa was rendered that traveling in trains is not permissible. But since this fatwa's disastrous effect affected both the Mullahs and their devotees, religious scholars closed the discussion on this fatwa by saying "because it is unavoidable to travel in train we can prayer because there is no other alternative." But still, I have seen some pious people praying at a train stop so frantically that even the recording-keeping angels might have had hard time to keep up with them! And in some cases the train left in the middle of their prayer. Afterwards, they were sitting on the platform worrying sick what to do. Even their luggage was gone. When people asked them why did they do this when they knew they might miss the train? They angrily replied: the world is meant to be a suffering place for believers and heaven for the unbelievers; that whatever difficulties befalls on a believer in this world he should patiently bear them.

An elder Maulvi Sahib used to declare many people Kafir in every matter by saying, "If you act like other people, then you are from among them." One summer evening the Maulvi Sahib came to the house of a person to argue with him who opposed his fatwa. The person was sitting in the porch and suggested that it would be better to discuss the issue in the lawn which had a bench and some chairs. The person sat on the bench and respectfully offered to Maulvi Sahib the chair. When Maulvi Sahib sat on the chair the person echoed the Maulvi Sahib's fatwa: "If you act like other people, then you are from among them!"

When so much superstition and unnecessary prejudice abounds in our people and our scholars, instead of trying to remove them, add more fuel to this fire then how will our people progress? Under this situation then, only if God forgives our sins, makes us steadfast, and helps us – only and only then there is some hope for us: رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا (2:250) – "O Our Sustainer! Endow us with steadfastness and firmness." Beyond this, I do not want to put forth before you the rest this verse!

Please believe me that unless we create the best institutions for our nation whether they are for educational purposes or whether they are meant to take care of our orphans; that unless we build the highest quality infrastructure for these institutions similar (or close) to Europe, and provide all the essential wherewithal and amenities to our children's quality education and training that are available to European children – until then our people's progress is not going to happen. No doubt, a large sum is required for this purpose. But if our nation becomes focused, determined, and works earnestly for this one common goal; then I am

quite confident that there will be no shortage of funds. In fact, our people are capable of doing more than what is required to accomplish this task provided, as Sir Auckland Calvin has said, we break our self-crafted idols and focus on our people's progress and welfare.

Sir Auckland Calvin has said that in the world today there are as many self-crafted idols as there were in Arabia in seventh century. One of the self-crafted idols is that "we will continue to follow our ancestors' path of education and their ways of learning and discussion." Another self-crafted idol is that "we should refrain from and suspect anything that is different from what our Islamic state and religion passed on to us." Another idol is that "we feel proud about our ethnicity, national heritage and our clique." Our other extremely dangerous idol is our "laziness, carelessness, and irresponsibility." All these idols are dumb and reside in the dark recesses of hearts which make us anxious and afraid of change and make us spew hatred and prejudice. All our self-crafted idols are senseless in their claims and must be discarded, no matter how much we love and rationalize and justify them.

Our very first Imam, Prophet Ibrahim (PBUH) broke all idols of his time and our last Prophet (PBUH) broke all idols and removed them from the Kaaba. Therefore, we should follow them and break all our self-crafted intellectual, emotional, and spiritual idols and remove them from our hearts and minds without which we will never be able to achieve success and progress.

For some time, by mistake, we made Kaaba an idol-shrine;
It is time to bring out those idols out of our heart's shrine!

فیصل آباد کے احباب کے لئے ضروری اطلاع





اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور "طلوع اسلام" میگزین
فیصل آباد میں ہماری دو بزموں کے
علاوہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھی مل سکتے ہیں۔

فون نمبر:
0322-6386991

حکیم عبدالمجید ہاؤس نمبر P-1479 سٹریٹ نمبر 1، محلہ فتح آباد، فیصل آباد

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔ شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔ جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔ اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہرحال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہم گر متضاد بھی ہیں۔ مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔ اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔ اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 72
ISSUE
3

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666 E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/
www.youtube.com/idaratolueislam/

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے
تیرا ہر اک ذرہ ہم کو اپنی جان سے پیارا
تیرے دم سے شان ہماری تجھ سے نام ہمارا
جب تک ہے یہ دنیا باقی ہم دیکھیں آزاد تجھے

